اردو لسانیات

مصنف

پروفیسر طفیل دارا

علمی کتاب خانہ
کبیر سٹریٹ
اردو بازار
لاہور

اردو لسانیات

مؤلّف

پروفیسر طفیل دارا

★

علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ، اردو بازار

لاہور

1974

(مطبوعہ: پنجاب آرٹ پریس لاہور)

مندرجات

دُنیا کی زبانیں

محمود شیرانی کے اس نظریہ کو تفصیلاً بیان کیجیے کہ اردو زبان کی ابتداء پنجاب سے ہوئی۔

محمود شیرانی نے اپنی مشہور کتاب "پنجاب میں اردو" کے ذریعہ بھرپور اور مدلل انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کی ابتدا پنجاب سے ہوئی اور پنجاب سے دہلی اور اس کے گرد و نواح میں پہنچی۔ محمود شیرانی کہتے ہیں کہ اردو برج بھاشا سے نہیں نکلی اردو اور برج بھاشا میں "ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان ۱۱۹۳ء میں محمد غوری کے لشکر کی صورت میں دہلی پہنچے تو اس وقت وہاں برج کا طوطی بول رہا تھا......... اور دوآبے میں برج زبان ہی مستعمل تھی (مگر) اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا۔ لہذا اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی پہنچی اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے گئے تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں، اور اس زبان نے اس زبان سے ارتقاء پائی ہو جو اس وقت دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی"۔ اپنے مذکورہ بالا دعوے کو محمود شیرانی نے درج ذیل تاریخی اور علمی دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے:

اردو زبان کی ابتدا کے متعلق اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مسلمان سرزمین پاک و بھارت پر آئے اور مسلمانوں اور یہاں کے لوگوں میں میل جول اور لین دین ہونے لگا۔ مگر یہاں اس تاریخی حقیقت کو پیش نظر ضروری ہے کہ بقول حامد حسن قادری مسلمانوں نے حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہد میں ۱۶ھ یعنی ۶۳۷ء میں بیت المقدس فتح کیا اور اسی سال انھوں نے ہندوستان کے ساحل سندھ پر حملہ کیا۔ مگر اسے فتح نہ کر سکے۔ اس کے بعد دو مرتبہ پھر حملہ آور ہوئے مگر پھر ناکام رہے۔ آخر حکومت بنی امیہ کے آغاز میں ۴۴ھ یعنی ۶۶۴ء کو کابل کی طرف سے حملہ آور ہو کر انھوں نے کابل سے ملتان تک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر یہ قبضہ دیر پا ثابت نہ ہوا اور مسلمانوں کا ہندوستان کے لوگوں سے نہ کوئی گہرا رابطہ پیدا ہوا اور نہ زیادہ مل جل کر رہنے کا موقع ملا۔ اسی لئے اس مختصر عرصہ میں کوئی زبان جنم نہ لے سکی۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ کو فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی اور اس کی فتوحات دور دور تک پہنچ گئیں اور مسلمان ان مفتوحہ علاقوں میں بس گئے اور وہ ایک دوسرے میں گھل مل بھی گئے مگر اس ملاپ کو ہم اردو زبان کی ابتدا نہیں کہہ سکتے اور سندھ کو اردو زبان کی جائے پیدائش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں فارسی زبان کے الفاظ کی کثرت ہے اور محمد بن قاسم کے تمام ہمراہی عربی بولتے تھے۔

مسلمانوں اور اہل ہند کے جس میل جول کے نتیجہ میں اردو زبان معرض وجود میں آئی اس کی بنیاد محمود غزنوی کا وہ حملہ تھا جو اس نے ۱۰۰۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور اس نے ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کر کے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ محمود کے جانشین اور ان کی افواج نے لاہور کو محمود پور کا نام دے کر اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا اور یہاں ۱۰۰۱ء سے ۱۱۸۷ء تک حکومت کی۔ ان مسلمانوں نے یہیں شادیاں کیں اور یہیں بس گئے۔ یہ مسلمان اور ان کی آئندہ نسلیں تقریباً دو سو برس (۱۱۸۷ء — ۱۰۰۱ء) تک یہاں کے لوگوں کے ساتھ مکمل طور پر مل جل کر رہے۔ اس سارے عرصہ میں انھوں نے یہاں کی زبان پر اثر اندازی کی اور خود ان کی زبان یہاں کی زبان کا اثر قبول کرتی رہی۔ ان کی اولادیں اپنی فارسی اور یہاں کی زبان دونوں جانتی تھیں۔ ایک طویل عہد تک ایک دوسرے سے چوبیس گھنٹے کے میل ملاپ سے ایک نئی زبان کی شکل سامنے آئی اور اسی زبان نے بعد میں اردو کا نام پایا۔

محمد غوری نے ۱۱۸۷ء میں پنجاب فتح کر کے یہاں غزنوی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ۱۱۹۲ء میں دہلی کو فتح کیا۔ اس موقع پر اس کے ساتھ اس کی غور سے ہمراہ آئی ہوئی فوجوں کے علاوہ یہاں مفتوحہ غزنوی حکومت کی فوجیں بھی تھیں جو محمد غوری کے ماتحت ہو گئی تھیں اور وہ وہی زبان بولتے تھے جو ان کے پنجاب میں تقریباً پونے دو سو برس کے قیام کے میل جول سے پیدا ہوئی تھی۔

محمود شیرانی لکھتے ہیں، "خطۂ پنجاب کے باشندے اپنے قد و قامت اور طبعی جرأت کی بنا پر فوجی خدمت کے لئے بہت موزوں اور مناسب ہیں، اس لئے سلطان محمود نے جو فوج ہندوستان سے انتخاب کی، وہ تمام پنجابی تھی۔ اس کے جانشین بھی پنجابی فوجیں رکھتے

تھے. جب (محمد غوری کے ہمراہ) دہلی کی طرف مہاجرت ہوئی تو ایک بڑی تعداد ان پنجابیوں کی بھی تھی. انہی ایام میں ملتانی لوگ بھی جوق درجوق جاکر دہلی میں آباد ہوگئے۔ ان میں سے بعض تجارت کرتے تھے[۵۱]........"

اگرچہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی مگر پنجاب پر غزنوی دور کی تقریباً پونے دوسو سالہ حکومت میں ایک زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار. بہرحال محمد غوری اور بعد میں قطب الدین ایبک کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوئے ہوں گے جس میں خود مسلمان گروہ ایک دوسرے سے گفتگو کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانہ میں وہ بولتے رہتے تھے[۵۲]۔"

اس مقام پر یہ امر خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ پنجاب سے دہلی جانے والی افواج مختلف قبائل سے تعلق رکھتی تھیں اور اس زمانہ میں مروجہ دستور کے مطابق ان افواج کے علاوہ ان کے سارے کے سارے قبائل بھی پنجاب سے اٹھ کر دہلی اور اس کے گردونواح میں جا بسے تھے، اور ان سب کی ایک مشترک زبان تھی جو وہ اپنے ساتھ پنجاب سے لے کر گئے تھے.

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مذکورہ بادشاہوں کے علاوہ پنجاب کی طرف سے مسلسل کئی افواج کسی نہ کسی غرض سے، دہلی گئیں اور وہیں کی ہو رہیں مثلاً جب خسرو ملک[۵۳] نے غداری کر کے خلجی خاندان کے تمام افراد کو قتل کر دیا، اور خود تخت دہلی پر قابض ہوگیا، تو غازی ملک (یہ پنجابی تھا اور خلجی بادشاہ دہلی کی طرف سے لاہور ملتان، سندھ وغیرہ کا گورنر تھا) ۱۳۲۰ء میں ایک بہت بڑی فوج لے کر لاہور سے نکلا

---

۵۱ پنجاب میں اردو صفحہ ۶۵ ۵۲ پنجاب میں اردو صفحہ ۶۷

۵۳ خسرو ملک ہندو سے بظاہر مسلمان ہوا تھا۔ اس نے اس روپ میں دہلی کے تخت پر قبضہ کر کے نہ صرف شاہی خاندان کے افراد کو بلکہ بے شمار مسلمانوں کو بھی قتل کروادیا تاکہ یہاں مسلمان ختم ہو جائیں۔

اور دہلی پر حملہ کر کے خسرو ملک کو شکست دی۔ اور لوگوں کے کہنے پر غیاث الدین تغلق کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا" غیاث الدین پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا تھا۔ جس نے وہاں آباد ہو کر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہوگا۔ اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی بولنے والے نظر آتے ہوں گے" ؎

لہٰذا پنجابی فوجوں، ان کے قبائلوں، تاجروں اور زندگی کے مختلف دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگوں کے دہلی جاکر وہیں آباد ہو جانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ان کی زبان نے آہستہ آہستہ وہاں اپنے پاؤں جما لئے اور برج بھاشا کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ پنجاب کی طرف سے بے شمار لوگوں کے دہلی کو ہجرت کر کے جانے کے سلسلہ میں محمود شیرانی لکھتے ہیں: "جب معز الدین اور اس کے والی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصہ میں اجمیر، ہانسی، سرستی، کہرام، میرٹھ، دہلی، بدایوں، قنوج، بنارس، تھہروالہ، تھنیکر، گوالیار، کالنجر، اودھ اور مالوہ فتح کر لئے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نئے علاقہ کے انتظام کے لئے ان کو کس قدر آدمی درکار ہوں گے کیونکہ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شہر میں ان کو اپنی چھاؤنی رکھنی پڑی ہوگی۔ چاروں طرف طاقتور ہندو راجہ موجود تھے جن کو قدرتاً مسلمانوں سے عداوت تھی، اس لئے ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان ایام میں شمال (پنجاب) سے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے ہندوستان کی طرف چلے گئے ہوں گے، اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ لاہور چونکہ پرانا دارالسلطنت تھا، اس لئے ضروری تھا کہ یہاں کے لوگ تبدیلی دارالسلطنت کے وقت بتقریب ملازمت و تجارت و دیگر خدمات زیادہ تعداد میں جائیں" ؎

جب پنجاب سے آئی ہوئی زبان دہلی اور اس کے گرد و نواح میں پھیل گئی، اور وہاں مسلمان فاتحین کے قدم جم گئے تو انھوں نے جنوبی ہند (دکن) کا رخ کیا اولاً علاؤ الدین اور پھر ملک کافور نے دکن پر مسلسل حملے کئے۔ ان کے بعد ایک بہت بڑا سیلاب محمد تغلق کے عہد حکومت میں اٹھا اور دکن میں جا کر رکا۔ محمد تغلق نے نہ صرف دکن پر فوج کشی کی بلکہ (دیوگرھ) (دیوگری) کو دولت آباد کا نام دے کر اس کو اپنا پایۂ تخت بھی قرار دیا۔ اس کے باعث

؎ پنجاب میں اردو، صفحہ ۴۴

نہ صرف اس کی افواج بلکہ دہلی اور اس کے چاروں طرف کے چار چار میل کے اندر اندر کی بستیوں کے تمام افراد کو بھی دیوگڑھ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا اور اس کی پوری طرح تعمیل ہوئی، اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے یہ لاتعداد لوگ دیوگڑھ میں جا بسے۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے اجازت دے دی کہ جو چاہے دہلی واپس جا سکتا ہے مگر سوائے ایک معمولی تعداد کے باقی سب لوگ دیوگڑھ ہی میں رہ پڑے۔ اس طرح ان لوگوں کے ساتھ اردو دکن میں پہنچی۔ اور جب حسن کانگو نے ۱۳۴۸ء میں پایہ تخت دہلی سے بغاوت کرکے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو اسی زبان کو اپنی سرکاری اور درباری زبان قرار دیا۔ اسی زبان کا ادب دکنی اردو ادب کے نام سے مشہور ہے۔ مذکورہ تاریخی حقائق کے بعد محمود شیرانی نے علمی، ادبی، لغاتی اور صرفی و نحوی شواہد کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ انھوں نے لکھا ہے: "ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف کے اعتبار سے پنجابی اور ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے اور دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں جملہ کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزاء بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد اور افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں[۱]۔"

محمود شیرانی نے کہا ہے کہ "آٹھویں اور نویں صدی ہجری یعنی تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ: اہل ہند "لاکھ" کو "لک" "پاگ" کو "پگ"، "کھانڈ" کو "کھنڈ"، "بھانڈ" کو "بھنڈ"، "آم" کو "انب"، "مونگ" کو "منگ" "گاڑی" کو "گڈی"، "گڑیا" کو "گڈی" اور "چقندر" کو "گنگلو" کہتے تھے۔ اہل پنجاب انھیں الفاظ کو آج بھی "لکھ" "پگ" "کھنڈ" "بھنڈ" "انب" "منگ" "گڈی گڈی" اور "گونگلو" بول رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا گیا[۲]۔"

اردو اور پنجابی دونوں میں مصدر کا قاعدہ ایک ہے یعنی امر[۳] کے آخر میں "نا" کی علامت بڑھا

---

[۱] مقدمہ پنجاب میں اردو صفحہ ۵ [۳] امر کے معنی حکم کے ہیں مثلاً کرنا سے کر، سینا سے سی وغیرہ

[۲] " " " " ۵

دیتے ہیں جیسے "پڑھ" سے "پڑھنا"، "لکھ" سے "لکھنا" وغیرہ

تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں جیسے

(۱) اکثر ایسے الفاظ جو "الف" پر ختم ہوتے ہیں، تانیث کی حالت میں "ی" پر ختم ہوتے ہیں مثلاً:

مذکر	بکرا	چنگا	گھوڑا	کالا
مؤنث	بکری	چنگی	گھوڑی	کالی

(ب) جب مذکر اسم حرف علت[1] کے سوا حرف صحیح[2] پر ختم ہو، تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لئے مذکورہ اسم کے آخر میں "نی" یا "انی" کا اضافہ کر دیتے ہیں، مثلاً

مذکر	مغل	اُونٹ	فقیر	زمیندار
مؤنث پنجابی	مغلانی	اُونٹنی	فقیرنی	زمیندارنی
مؤنث اردو	مغلانی	اُونٹنی	فقیرنی	زمیندارنی

(ج) اگر مذکر "ی" پر ختم ہو، تو مؤنث کی صورت میں "ی" "ن" سے بدل جاتی ہے، مثلاً:

مذکر	میراثی	تیلی	موچی	بھائی	نائی
مؤنث پنجابی	میراثن	تیلن	موچن	بھین	نائین
مؤنث اردو	میراثن	تیلن	موچن	بہن	نائن

اعلام[3]، اسماء، اور اسمائے صفت دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً

---

[1] حروف علت یہ ہیں: "ا" "و" اور "ی"۔ [2] حروف علت کے علاوہ باقی تمام حروف حروفِ صحیح ہیں [3] اعلام، علم کی جمع ہے۔ علم کے معنی ہیں وہ نام جس سے کوئی انسان مشہور ہو، خاص نام

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
منڈا	لڑکا	گھوڑا	گھوڑا
چنگا	اچھا	نِکا	چھوٹا
وڈا	بڑا	اُچا	اونچا
کھبا	اُلٹا	کنا	کت

اسماء صفات دونوں زبانوں میں تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف[1] کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً :

اردو	اونچا گھوڑا	میرا لڑکا	چھوٹی لڑکی	بڑے لڑکے	چھوٹی لڑکیاں
پنجابی	اچا گھوڑا	میرا منڈا	نکی کڑی	وڈے منڈے	نکیاں کڑیاں

اس مقام پر یہ امر توجہ کے لائق ہے کہ اوپر آخری فقرے میں پنجابی میں صفت و موصوف باہم متحد ہیں یعنی "نکیاں کڑیاں" میں صفت یعنی "نکیاں" بھی جمع ہے اور اس کا موصوف "کڑیاں" بھی جمع مگر اردو میں یہ بات نہیں ہے یعنی "چھوٹی لڑکیاں" میں صفت یعنی "چھوٹی" واحد ہے اور موصوف "لڑکیاں" جمع ہے۔ یہ بے ضابطگی میر و سودا کے عہد سے شروع ہوئی ورنہ قدیم اردو میں "چھوٹیاں لڑکیاں" ہی بولتے تھے جو پنجابی کے عین مطابق ہے احمد دکنی کا شعر

سو چاروں سے پالیاں سو بالیاں نکھیاں　　دفا شرم انوبھتے سکیاں سب سکیاں

دونوں زبانوں میں فعل تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہوتا ہے مثلاً؛

اردو	پنجابی	اردو	پنجابی
گھوڑا آیا	گھوڑا آیا	گھوڑے آئے	گھوڑے آئے
عورت آئی	بڈھی آئی	عورتیں آئیں	بڈھیاں آیاں

ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ مثلاً

[1] جس کی صفت بیان کی جائے مثلاً سفید کپڑا، اس میں "سفید" صفت ہے اور "کپڑا" موصوف

مذکر اردو	وہ آیا	وہ آئے	تو آیا	تم آئے	میں آیا	ہم آئے
پنجابی	اوہ آیا	اوہ آئے	توں آیا	تسی آئے	میں آیا	اسی آئے

مونث اردو	وہ آئی	وہ آئیں	تو آئی	تم آئیں	میں آئی	ہم آئیں
پنجابی	اوہ آئی	اوہ آئیاں	توں آئی	تسی آئیاں	میں آئی	اسی آئیاں

جمع مؤنث (خط کشیدہ) کے صیغوں میں جو فرق پنجابی اور اردو میں ملتا ہے یہ متاخرین کی اصلاحی کوشش کا نتیجہ ہے، جس نے قدما کے قاعدوں کو بالکل درہم برہم کردیا ورنہ وہ بزرگ ان صیغوں کو یوں بولتے تھے۔ "وہ آئیاں" "تم آئیاں" اور "ہم آئیاں" اس سلسلہ میں محمد امین دکنی کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

مصر میں خوب صورت بیبیاں تھیاں ٭ انوں سنیاں زلیخا کی سو باتاں

مستقبل کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہے یعنی "واحد میں گا" اور جمع میں "گے" کے اضافہ سے بنتا ہے۔ مثلاً

اردو	وہ آئیگا	وہ آئینگے	تو آئیگا	تم آؤگے	میں آؤنگا	ہم آئینگے
پنجابی	اوہ آویگا	اوہ آوینگے	تو آویگا	تسی آؤگے	میں آواں گا	اسی آواں گے

قدیم اردو میں "آوے گا" اور "آویں گے" ہی بولتے تھے۔ بعد میں اصلاح کرنے والوں نے یہ تبدیلیاں کیں۔ ان دونوں کا مجموعی اثر سارے جملہ پر محیط ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف جملہ کے فاعل بلکہ اس کے متعلقات اور ان کے توالعات پر بھی اثرانداز ہوتا ہے مثلاً

اردو | مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں

پنجابی | مرن والیاں کڑیاں دیاں ماواں روندیاں روندیاں کہندیاں سن

قدیم اردو میں یوں لکھا جاتا تھا:

"مرن والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں

جملے پر جمع کا یہ اثر پنجاب اور دکن کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، بلکہ دہلی کے فصحا بھی اسی طرح لکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں سوداؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

جب لبوں پر یار کے مستی کی دھڑیاں دیکھیاں ⁂ جو زحل کی ساعتیں اس دل پہ گھڑیاں دیکھیاں

پنجابی زبان کا قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے لفظ کے آخر میں ایک یائے کا اضافہ کر دیتے ہیں جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہوتے جیسے نظر سے نظری، حیات سے حیاتی۔ محمد امین دکنی کے اس شعر میں مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

ہماری موت اور ان کی حیاتی ⁂ اگر ہوتی تو مجھ کوں اے خوش ہوتی
عزوری کا پیالہ جن پیا ہے ⁂ انے اپنے سر اوپر دکھ لیا ہے

ان اشعار میں "حیات" اور "عزور" پر یائے کا اضافہ کر کے "حیاتی" اور "عزوری" بنا لیا ہے۔

چپ چپاتے اور چپ چپاتا ایک اردو محاورہ ہے جس میں چپاتے یا چپاتا کو اہل اردو تابع مہمل یعنی بے معنی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے صرف حسن کلام کے لئے بڑھا دیا گیا ہے مگر پنجابی زبان میں یہ لفظ (چپاتا) ہے اور بامعنی ہے۔ اردو کے برخلاف یہ لفظ پنجابی میں علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً عبدالحکیم کا پنجابی شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

عذر آکھن کنوں ہویا چپاتا ⁂ عبدان یعقوب اس گل نوں پچھاتا

دان دہاڑے ایک اردو محاورہ ہے اہل اردو دہاڑے کو بھی تابع مہمل یعنی بے معنی مانتے ہیں مگر حسب معمول وہ یہاں بھی غلطی پر ہیں دہاڑا درحقیقت پنجابی لفظ ہے اور دن کے معنی دیتا ہے۔ اور اردو کے برخلاف تنہا استعمال ہوتا ہے۔ عبدالحکیم کا یہ شعر ؎

شہر مدین کنول اس کھوہ دے پھیر ⁂ آیا جو تھے دہاڑے قافلہ گھیر

اکثر ایسے مصادر ہیں جو پنجابی اور اردو میں مشترک ہیں، لیکن بہت سے ایسے مصادر ہیں جو فی زمانہ اردو میں متروک ہیں اور پنجابی میں رائج ہیں ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

آکھنا: اس کے معنی ہیں کہنا، بیان کرنا اور دریافت کرنا پنجابی میں رائج ہے اس کی مثال پرانی اردو میں موجود ہے۔ محمد امین دکنی کا ایک شعر ہے ؎

نہیں اس سے بہتر چھپائی میں راکھی ⁂ حقیقت سب تری ہیں سچ کوں آکھی

سڑنا: پنجابی میں جلنے کے معنوں میں آتا ہے پرانی اردو میں رائج تھا محمد افضل جھنجانوی متوفی ۱۰۳۵ھ مطابق ۱۶۲۵ء کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ارے آساں تجا لوں عشق کرنا
متن اس آگ موں ہر گز نہ سڑنا

لوڑنا: ضرورت ہونا۔ پرانی اردو میں موجود تھا۔ احمد دکنی کا ایک شعر ؎

کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب
جو لوڑے زیادہ پہ دے بے حساب

اردو زبان کی پنجاب سے ابتدا کے متعلق محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں جو کثیر تعداد اور تشریحاً پھیلا کر شواہد اور دلائل پیش کئے ہیں مذکورہ بالا سطور میں ان کا چیدہ اور مختصراً بیان پیش کیا گیا ہے یہ اس امر کا واضح اور کافی ثبوت ہے کہ اردو اور پنجابی کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ اکثر اس وقت ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقہ نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی اس سے پہلے کی دکنی اردو ان اصلاحوں سے پاک اور پنجابی کے بہت مشابہ ہے۔

نواح دہلی کی بولیاں اُردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور حضرت دہلی اس کا صحیح مولد و منشا" ڈاکٹر مسعود حسن کے اس خیال کی وضاحت کیجئے؛

ڈاکٹر مسعود حسن کہتا ہے کہ " نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں" نواح دہلی کی بولیاں کھڑی بولی سے متشکل ہوئیں اور شمالی ہندوستان میں اردو زبان کے ارتقاء کی داستان عہد اپ بھرنش سے شروع ہوتی ہے[1] "کھڑی بولی اور اپ بھرنش کو سمجھنے کے لئے ہمیں ڈاکٹر مسعود حسن کے ساتھ لسانی اعتبار سے تاریخ کے اس دور سے آغاز کرنا ہوگا جب آریہ وسط ایشیا سے نکل کر مشرق و مغرب کی مختلف اطراف میں پھیلتے ہوئے ہندوستان پہنچے آریہ لوگ وسط ایشیا سے اٹھے اور مشرق و مغرب میں پھیل گئے۔ جو لوگ یورپ کی طرف نکل گئے ان کی زبان ہند یورپی کہلائی جو جماعتیں ایران میں جا بسیں ان کی زبان نے "ہند ایرانی" کا نام پایا نقل مکانی کے پہلے ٹھکانوں میں آریوں نے اپنی زبان کو علاقائی زبانوں سے پاک و صاف رکھا مگر ایران میں ان کی زبان میں فطری طور پر ردوبدل ہونے لگے اور اس نے ایران میں پہلے بسنے والے لوگوں کی زبانوں کو متاثر بھی کیا اور خود بھی اس سے متاثر ہوئی۔

آریوں کی ہندوستان میں آمد کا زمانہ ۱۵۰۰ قبل مسیح مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ یہ ہند یورپی زبان بولنے والے آریہ داخلہ ہندوستان سے قبل ایک عرصہ دراز تک ایران اور خصوصاً مشرقی ایران میں رہتے آئے تھے، جہاں ان کی زبان ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی ۲۰۰۰ قبل مسیح تک "ہند ایرانی" منزل تک پہنچ چکی تھی۔ "ہند یورپی" زمانہ کی یہ "ہند ایرانی" شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی جاتی ہے جو بعد کو ایران میں پھیلیں، اور جسے بولتے ہوئے آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ہندوستان میں آریوں کا سامنا دراویدی اور آسترک قوموں سے ہوا جنھیں فتح کرنے میں آریوں کو کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ وہ بالآخر شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ اب آریوں نے دراویدیوں پر اثر ڈالا بھی اور خود بھی ان کا اثر قبول کیا۔ کیونکہ ہندوستان میں آریوں کو دراویدیوں کے ایسے تمدن سے واسطہ پڑا، جو کئی لحاظ سے ان کے تمدن پر فوقیت رکھتا تھا لہذا کئی دیگر باتوں کے علاوہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان زبانوں کا آریائی زبان کے

[1] تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسن خاں صفحہ ۲۰۳

قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور اس طرح آریائی زبان نے "ہند ایرانی" منزل سے گزر کر "ہند آریائی" شکل اختیار کر لی۔

آریائی زبان کا قدیم ترین اور مستند نمونہ رگ وید کی شکل میں ملتا ہے۔ رگ وید کے ابتدائی حصے تو تقریباً اڑھائی ہزار برس قبل مسیح کی تصنیف ہیں لیکن اس کے آخری باب آٹھویں صدی قبل مسیح میں تصنیف ہوئے۔ "ہند یورپی" زبان ۱۰۰۰ قبل مسیح سے پہلے ہی "ہند ایرانی" کی منزل سے گزر کر خالص "ہند آریائی" شکل اختیار کر چکی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ آریہ ایران سے نکل کر ہندوستان آتے ہوئے ابھی دریائے سندھ تک ہی پہنچ پائے تھے کہ ان کی زبان ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔ لیکن رگ وید کے بیشتر منتر اسی سادہ زبان میں ہیں جو اس وقت آریہ لوگوں کے گھروں میں بولی جاتی تھی۔ اگرچہ آریوں کے مختلف قبائل کی بولیوں میں خفیف سے اختلافات تھے، لیکن رگ وید کی زبان کو سب ہی معیاری مانتے تھے۔

آریہ ۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ قبل مسیح تک کے عرصہ میں شمالی ہند میں پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل گئے۔ اس طرح دور دراز علاقوں میں پھیلنے اور غیر آریہ اقوام سے ربط و ضبط بڑھنے کی وجہ سے آریہ زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی۔ صرفی، نحوی اور صوتی اختلافات پیدا ہونے لگے آریہ زبان کے ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں بولی جانے لگیں، مشرقی ہندوستان کے صوبوں میں یہ تبدیلیاں تیزی سے نمایاں ہونے لگیں اور ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اس طرح ہندوستان کے مختلف علاقوں کی زبانوں نے اپنی ضرورت اور مزاج کے مطابق آریوں کی زبان کے لفظوں میں رد و بدل کر کے انھیں اپنے اندر سمو لیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں آریوں کا مرکز پنجاب تھا اور ان کی زبان جیسے جیسے مرکز سے دور ہو کر مشرق کی طرف پھیلتی گئی ویسے ویسے وہ اپنے اصل سے دور ہوتی چلی گئی۔

مسعود حسن خان نے اس دور کی لسانی گروہ بندی یوں کی ہے :-

۱۔ اودیچیہ : شمال مغربی ہندوستان کی زبان ۲۔ مدھ دیشیہ[1] : انبالہ سے الہ آباد تک کی زبان

---

[1] مدھ دیشیہ : انبالہ سے الہ آباد تک کا علاقہ

۳۔ پراچیہ، مشرقی ہندوستان کی زبان

"اودیچ (شمال مغربی ہندوستان کی زبان) کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ وہ آریوں کی قدیم معیاری زبان کے قریب تر تھی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں یہی زبان زیادہ صحیح اور کھری سمجھی جاتی تھی اور لوگ آریوں کی معیاری زبان کی سند اس علاقہ سے لیتے تھے۔

"پراچیہ زبان کا رواج آریوں کے ان قبائل میں تھا جو موجودہ اودھ، مشرقی یوپی اور مغربی بہار کے بعض حصوں میں آباد تھے۔ یہاں کی زبان دیسی بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لب ولہجہ کسی حد تک کھو چکی تھی۔ مغربی ہندوستان میں بسنے والے آریہ پراچیہ زبان بولنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی زبان کو "ناپاک" کہتے تھے۔

"مدھ دیش کی زبان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ یہ وسطی ہندوستان کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ یہاں کی زبان نہ تو اس قدر معیاری سمجھی جاتی تھی جس قدر کہ شمال مغربی ہندوستان کی زبان، اور نہ اس قدر ذلیل اور پست جیسی کہ پراچیہ کی بولی۔"

بعد میں آہستہ آہستہ جیسے جیسے آریائی زبان اور تمدن کا مرکز شمال مغربی ہندوستان یعنی پنجاب سے ہٹ کر دوآبہ گنگا جمنا ہوتا گیا مدھ دیش (دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقے) کی زبان کو ممتاز حیثیت دی جانے لگی۔

"اسی زمانہ میں زبان کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ صوبائی اور مقامی تعصبات سے ہٹ کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا گیا جو سب جگہ رائج تھے، اس طرح زبان صوبائی یا علاقائی زبانوں کے بجائے ملکی بن گئی۔ سب لوگ ادب میں ایک خاص قسم کی ٹکسالی زبان استعمال کرنے لگے اور یہ زبان بن سنور کر سنسکرت (پاک وصاف) ہو گئی۔ اس زمانہ میں سنسکرت کو وہی مقام حاصل تھا جو آج اردو کو ہے۔ مشرقی ہندوستان کے لوگ اسے بول نہیں سکتے تھے مگر سمجھ وہ بھی لیتے تھے۔ اس طرح سنسکرت ہندوستان کی کثرت میں وحدت یعنی رابطے کا کام دیتی تھی۔

اسی زمانہ میں دراصل لفظ سنسکرت صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اور سنسکرت

زبان سے مراد "شستہ زبان" لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ سنسکرت کا لفظ ایک خاص زبان کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یہ تقریباً ۳۰۰ قبل مسیح کا زمانہ ہے اب سنسکرت زبان ادب اور مذہب کے لئے استعمال ہونے لگی اور عوام کی زبان سے دور ہونے لگی۔ اس طرح سنسکرت زبان کا رواج رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ اور اس کی جگہ دوسری علاقائی بولیاں ابھرنے لگیں۔ سنسکرت کے رواج کے کم ہونے اور مقامی بولیوں کے ابھرنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ مہاویر سوامی اور مہاتما بدھ نے اپنے اپنے دھرم کی تبلیغ اپنی اپنی علاقائی زبان میں کی۔ اس سے "پالی" زبان کو ابھرنے اور ترقی کرنے کا بہت بڑا موقع مل گیا اور اس نے سنسکرت کی جگہ لے لی۔

آریوں کی ابتدائی زبان سے "ویدک سنسکرت" اور "ادبی سنسکرت" پیدا ہوئیں ویدک سنسکرت عام بول چال کی زبان کے قریب تھی۔ مگر ادبی سنسکرت نے گنے چنے، شائستہ اور بلیغ الفاظ ہی کا خزانہ جمع کیا۔ اور عوامی دسترس سے باہر ہوگئی۔ علاقائی بولیوں نے ویدک زبان کے انداز کو اپنایا۔ اور ترقی کی۔ ان کے اسی عوامی انداز اور الفاظ کی وجہ سے انھیں پراکرت (فطری) کہنے لگے۔ اب گویا سنسکرت کی جگہ مختلف علاقوں کی بولیوں یعنی پراکرتوں نے لے لی۔

پراکرت کے سب سے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا پھر راجہ اشوک (۲۵۰ ق م) کی لاٹوں پر کندہ کی ہوئی عبارات کی صورت میں ملتے ہیں اور یہی پہلی پراکرت تھی۔ جب اس پراکرت نے ادبی صورت اختیار کرلی اور اس پر شورسینی[۱] پراکرت کا پورا اثر پڑ چکا تو اس زبان کو "پالی" کا نام دیا گیا۔ اسی پالی کو قدیم ماگدھی" بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ ماگدھی[۲] بعد کی نئی ماگدھی زبان سے مختلف ہے۔

اس وقت مغربی پراکرت کی نمایاں شکل "شورسینی پراکرت" تھی اور مشرقی پراکرت "ماگدھی" کہلاتی تھی۔ "ماگدھی" مگدھ دیس یعنی جنوبی بہار میں بولی جاتی تھی۔

مسعود حسن نے ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ عیسوی تک کے زمانہ کو آریائی زبان کا

---

[۱] شورسین: متھرا اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ کا نام [۲] مگدھ: جنوبی بہار کا علاقہ

وسطی دور قرار دیا ہے۔ اس دور میں ایک طرف سنسکرت ترقی کرتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ پراکرتیں بھی آگے بڑھتی رہیں۔ اس عہد کی ادبی پراکرتوں کی یہ پانچ واضح شکلیں نظر آتی ہیں :-

۱۔ مہاراشٹری : ادبی حیثیت سے اس زمانہ میں مہاراشٹری پراکرت کو سب سے زیادہ عروج حاصل تھا۔ قواعد نویسوں نے اسے نمونہ مانا ہے اور اس کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے دوسری پراکرتیں کئی ایک باتوں میں مہاراشٹری سے ملتی جلتی تھیں۔

۲۔ شورسینی : شورسینی کا مرکز شورسین دیس یعنی دوآبہ گنگا جمنا کا وہ وسطی حصہ تھا جسے متھرا کہتے ہیں۔ اعلیٰ طبقہ میں سنسکرت کے بعد شورسینی ہی رائج تھی۔ اس زبان پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ متھرا یعنی دوآبہ گنگا جمنا ہی وہ علاقہ ہے جہاں سنسکرت اور شورسینی پراکرت دونوں پروان چڑھی تھیں۔ شورسینی پراکرت سن عیسوی شروع ہونے سے پہلے ہی مسلم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

ماگدھی : یہ مگدھ دیس یعنی جنوبی بہار کی پراکرت تھی۔ چونکہ یہ آریائی تمدن کے مراکز سے کافی دور تھی اس لئے یہ ایک غیر مہذب اور ناشائستہ زبان سمجھی جاتی تھی۔

اردھ ماگدھی[۱] : اردھ ماگدھی اس علاقہ کی پراکرت تھی جسے آج کل پورب اور اس زمانہ میں پراچیہ کہتے تھے۔ گوتم بدھ اور مہاویر دونوں نے اپنے زمانہ میں اپنے اپنے دھرم کی تبلیغ اسی پراکرت کی قدیم شکل میں کی تھی۔

پشاچی پراکرت : یہ پراکرت اس زمانہ میں پنجاب اور کشمیر کے علاقہ میں بولی جاتی تھی یہ اتنے دھندلکے میں تھی کہ عوام میں یہ بھوت پریت کی زبان کے نام سے مشہور ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر مسعود حسن کے نزدیک آریائی زبانوں کا تیسرا دور ۶۰۰ء سے لے کر ۱۰۰۰ء تک ہے اس دور میں "اپ بھرنش" نے جنم لے کر "پراکرت"

---

[۱] اردھ ۔ بمعنی نصف

کی جگہ لینی شروع کی۔

جب پراکرتوں نے بھی ادبی سنسکرت کی طرح ادبی صورت اختیار کرنا شروع کی، تو وہ عوام کی زبانوں کی ڈگر سے دور جا پڑیں اور عوام کی زبانوں کا دھارا آگے بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ عوام کی اسی بول چال کی زبانوں کو اس عہد کے قواعد نویسوں نے "اپ بھرنش" یعنی بگڑی زبانیں کہا ہے۔ بعض محققین کے نزدیک اپ بھرنش کی مثالیں پراکرت کے ادب میں چھٹی صدی عیسوی میں ملنی شروع ہو گئی تھیں اور بعض کے خیال کے مطابق تیسری صدی عیسوی میں۔ مگر دقتِ نظر کے بعد یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کے آثار تیسری یا دوسری صدی عیسوی کی پراکرتوں کے ادب میں ملتے ہوں مگر یہ پروان چھٹی صدی عیسوی میں چڑھتی ہے ڈاکٹر سدھیشور ورما کا بھی یہی خیال ہے۔

ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کا زمانہ ۱۰۰۰ عیسوی مقرر کیا گیا ہے لیکن اپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی صدی سے لے کر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے۔

شروع شروع میں "اپ بھرنش" کسی خاص زبان کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ پڑھے لکھے لوگ ان پڑھوں کی زبان کو "اپ بھرنش" یا "اپ بھاشا" کہا کرتے تھے۔ "اپ بھرنش" میں سنسکرت کے بگڑے ہوئے لفظوں کی تعداد خالص سنسکرت لفظوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ سنسکرت کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی اپ بھرنش (بگڑے ہوئے لفظ) ملتے ہیں۔

اپ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پا کر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا، اور اس میں بھی شعر و ادب پیدا ہونے لگا۔ اپ بھرنش کا اثر پوربی زبانوں نے بھی قبول کیا۔ لیکن گجرات، راجپوتانہ اور دوآبہ (گنگا جمنا کا علاقہ) میں بولی جانے والی بولیوں پر اس کی گہری چھاپ پڑی۔ چنانچہ ۸۰۰ عیسوی سے ۱۰۰۰ عیسوی تک دوآبہ کی سورسینی اپ بھرنش[۱] ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی زبان بن گئی اس کا سب سے

---

[۱] دوآبہ گنگا جمنا کے علاقہ میں بولی جانے والی زبان کا نام سورسینی تھا جب یہ اپ بھرنش سے متاثر ہوئی تو اسے "سورسینی اپ بھرنش" کہنے لگے۔

بڑا سبب راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا، جن کا دارالحکومت اس وقت گنگا کی ترائی میں شہر قنوج تھا۔ اس کے علاوہ گجرات کے جینیوں نے بھی اپنے دھرم کی تبلیغ سے اسے کافی ترقی دی۔ اس طرح "شورسینی اپ بھرنش" اس وقت شمالی ہند کی "لنگوا فرینکا" کی حیثیت اختیار کر گئی، جو گجرات اور مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔ اس کا ادب آٹھویں سے تیرھویں صدی عیسوی تک میں ملتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے گجرات اور راجپوتانہ کے جینیوں نے شورسینی اپ بھرنش میں ادب کا بڑا حصہ چھوڑا ہے۔ بنگال میں بدھ مت کے مبلغوں نے اپنے مذہبی امور کے لئے اسی زبان کو اپنایا۔ پنجاب میں "گورکھ پنتھیوں" نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے اسی کو استعمال کیا۔ مذہب اور ادبیات سے قطع نظر دوآبہ (گنگا جمنا کا علاقہ) اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں یہ گھریلو زبان کی حیثیت سے رائج تھی؛ جس میں عوام کی مذہبی اور عشقیہ واردات کے گہرے نقش ملتے ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر رہ گئی اپنے آخری دور (۱۰۰۰ عیسوی) میں یہ بہت کچھ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی قدیم شکل سے ملتی جلتی ہے[۱]۔ موجودہ ہندوستانی زبانوں اور شورسینی اپ بھرنش کی درمیانی منزل کو بعض اوقات "اوہٹ" بھی کہا گیا ہے۔ یہ صحیح طور پر بتانا ذرا مشکل ہے کہ اپ بھرنش کس سن میں ختم ہوتی ہے اور موجودہ آریائی زبانوں کا کب آغاز ہوتا ہے لسانی تبدیلیاں چپکے اور چھپ کے رونما ہوتی ہیں۔ اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ جدید زبانوں کا آغاز ۱۰۰۰ عیسوی سے ہوتا ہے یہ بڑا سیاسی الٹ پھیر کا زمانہ تھا مسلمان آناً فاناً شمالی ہند کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک نیا تمدن اور نئی زبان آ رہی تھی۔ انھوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی مختلف زبانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھایا ہندوؤں کی ازمنۂ وسطیٰ کی مذہبی تحریکوں سے ان کو تقویت پہنچی، چنانچہ بہت جلد ان زبانوں میں مذہبی گیتوں اور کتابوں کا موجودہ ہندوستانی زبانوں میں ایک بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا۔

---

[۱] یہ مشابہت اس لئے ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسن کے نظریہ کے مطابق موجودہ زبانیں شورسینی اپ بھرنش سے ہی نکلی ہیں

مذکورہ بالا بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ اپ بھرنشوں سے ہوئی ہے ان موجودہ زبانوں کا سلسلہ حسب ذیل اپ بھرنشوں سے ملایا جا سکتا ہے:

۱:۔ شورسینی اپ بھرنش (ا) کھڑی بولی یا ہندوستانی (موجودہ اردو و ہندی[۱])
(ب) راجستھانی (ج) پنجابی (مشرقی یعنی موجودہ بھارتی پنجاب کی زبان) (د) گجراتی اور پہاڑی بولیاں

۲:۔ ماگدھی اپ بھرنش: اس کا علاقہ بہت وسیع تھا، اس لئے مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام پڑ گئے۔ بنگال میں "پراچیہ"، "گوڑ"، اور "ڈھکی" کہلائی جس سے موجودہ بنگالی اور آسامی زبانیں نکلیں۔ اڑیسہ میں اس کا نام "ات کلی"، پڑا جس سے موجودہ زبان اڑیا نے جنم لیا۔ بہار کی تمام بولیاں اس کے تحت آجاتی ہیں۔ بہار کی ایک بولی کا نام "مگہی" ہے۔ جو ماگدھی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے

۳:۔ اردھ[۲] ماگدھی اپ بھرنش۔ پوربی ہندی (اودھی وغیرہ)

۴:۔ مہاراشٹری اپ بھرنش۔ اس کا خاص مرکز موجودہ برار تھا۔ سنسکرت میں اسی صوبہ کو مہاراشٹر کے نام سے پکارا گیا ہے۔

۵:۔ شمال مغربی ہندوستان کی پراکرتیں اور اپ بھرنش ابھی تک دھندلکے میں ہیں۔ ان کا نقشہ حسب ذیل ہو سکتا ہے: (ا) پراچڑ اپ بھرنش (ب) سندھی (ج) کیکئی اپ بھرنش (د) لہندا (مغربی یعنی موجودہ پاکستانی پنجاب کی زبان)

لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے جو اس عہد کی بولیوں میں واحد اور ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی اور جس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا۔ ہر عہد میں اس علاقہ کی زبان کا مرکز متقرار رہا تھا۔

مغربی ہندی کے حدود تقریباً وہی ہیں جو مدھ دیش کے ہیں۔ یہ مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک اور شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیاچل پہاڑ اور بندیلکھنڈ

---

[۱] اس سے واضح ہو گیا کہ کھڑی بولی یا ہندوستانی شورسینی اپ بھرنش سے نکلی اور اردو کھڑی بولی یا ہندوستانی سے اس ہندوستانی کو مغربی ہندوستانی کہتے ہیں۔ [۲] اردھ یعنی نصف

کے علاقہ تک بولی جاتی ہے۔ اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اور جنوب مشرق میں مرہٹی اور مشرقی ہندی۔ شمال میں یہ پہاڑی بولیوں (جونسوی، گڑھوالی اور کمایونی) سے گھری ہوئی ہے

مغربی ہندی مدھ دیش کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے۔ کیونکہ اسی علاقہ میں سنسکرت، شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش پروان چڑھی تھیں اور جن کی سچی جانشین اس علاقہ کی جدید بولیاں یعنی کھڑی بولی (ہندوستانی) "برج بھاشا" ہریانی وغیرہ ہیں، جن کے مجموعہ کو گریرسن مغربی ہندی کا نام دیتا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ شورسینی اپ بھرنش سے کھڑی بولی نکلی اور کھڑی بولی سے اردو نے جنم لیا کیونکہ شورسینی اپ بھرنش اور کھڑی بولی دونوں یکے بعد دیگرے دوآبہ گنگا جمنا سے اٹھیں اور پروان چڑھیں، اس لئے اردو کا آغاز بھی دوآبہ گنگا جمنا اور دہلی کے گرد و نواح سے ہوا اس کے علاوہ اردو اپنی صرف و نحو میں کھڑی بولی سے بے حد قریب بلکہ مشابہ ہے۔

درج ذیل پر نوٹ لکھیے

سنسکرت

قدیم زمانہ میں آریہ وسطِ ایشیا سے اٹھے اور ان کے مختلف گروہ مغرب و مشرق میں پھیل گئے۔ مغربی ممالک میں جاکر بسنے والوں کی زبان ہند یورپی کہلائی۔ مشرق کی طرف آنے والے پہلے ایران میں گئے اور صدیوں رہے اس طویل عرصہ میں ان کی ابتدائی زبان ایران کی مختلف زبانوں سے متاثر ہوئی اور اس میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس زبان کو ہند ایرانی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اُن میں سے آریوں کے کچھ گروہ یہی ہند ایرانی زبان بولتے ہوئے تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح میں دریائے سندھ عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہوئے اور شمالی ہند کے دراویدیوں کو شکست دینے کے بعد یہاں قابض ہو کر بس گئے۔ یہاں ہند ایرانی زبان نے اس وقت کے ہندوستان کی زبانوں سے اثر قبول کیا اور اس زبان کو ہند آریائی کہا گیا

دریائے سندھ سے آریہ جوں جوں مشرق کی طرف بڑھے، ان کی زبان پر صوبجاتی اور علاقائی بولیوں (کول اور دراویدی وغیرہ) کا بھی اثر پڑا۔ یہ اثر صرف تلفظ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ان کی زبان میں یہاں (ہندوستان) کی دیسی زبان کے الفاظ کی آمیزش بھی ہونے لگی۔ آریوں کے رفتہ رفتہ ملک کے دور دراز حصوں میں پھیلنے اور غیر آریہ اقوام سے میل ملاپ بڑھنے کی وجہ سے آریہ زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی۔ صرفی ونحوی اور صوتی اختلافات پیدا ہونے لگے ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں بولی جانے لگیں۔ بعض جگہ الفاظ کو اجنبی صوتیات سے متاثر ہو کر توڑ مروڑ دیا جاتا۔ حروف کا تلفظ بھی مختلف طریقوں سے کیا جانے لگا۔ مشرقی ہندوستان کے صوبوں میں یہ تبدیلیاں تیزی سے نمایاں ہونے لگیں۔ ۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۷۰۰ قبل مسیح تک آریہ شمالی ہند میں پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل چکے تھے اور ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی انہی علاقائی تبدیلیوں کی وجہ سے اس وقت کے مغربی ہندوستان کی زبان کو "اودیچہ"، وسطی ہندوستان کی زبان کو "مدھ دیشیہ" اور مشرقی ہندوستان کی زبان کو "پراچیہ" کا نام دیا گیا

آریوں کی زبان میں مذکورہ تبدیلیوں کی بنا پر اس زمانہ میں زبان کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ صوبائی اور مقامی تعصبات سے بالا ہو کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی

جانا گیا جو سب جگہ رائج تھے۔ اس طرح زبان صوبائی یا علاقائی ہونے کے بجائے ملکی بن گئی اور سب لوگ ادب میں یہ خاص قسم کی ٹکسالی زبان استعمال کرنے لگے اور یہ زبان بن سنور کر سنسکرت یعنی آلائشوں سے پاک وصاف ہو گئی۔

شروع شروع میں لفظ سنسکرت صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور سنسکرت سے مراد ٹھیک وہ زبان لیتے تھے جسے ہم آج کل اردو میں شستہ زبان کہتے ہیں مگر بعد میں آہستہ آہستہ اسی ٹکسالی آریائی زبان کو سنسکرت کہنے لگے۔

سنسکرت کی دو قسمیں تھیں ایک ویدک سنسکرت دوسری ادبی سنسکرت ویدک سنسکرت وہی ہے جس میں ویدوں کے منتر لکھے گئے ہیں اور یہ سنسکرت اس عہد کی عام بول چال کی زبان کا نمونہ پیش کرتی ہے دوسری ادبی سنسکرت ہے یہ عام بول چال سے مختلف اور ادبی زبان تھی۔

اس زمانہ میں سنسکرت کو شمالی ہندوستان میں وہی مقام حاصل تھا جو آج اردو کو ہے۔ یہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ مشرقی ہندوستان کے لوگ اسے بول نہیں سکتے تھے، مگر سمجھ وہ بھی لیتے تھے گویا سنسکرت اپنے عہد کی لنگوا فرینکا تھی۔

آہستہ آہستہ سنسکرت یعنی ادبی سنسکرت نے اپنے آپ کو خاص حدود کے اندر بند کر لیا اور اس کے تقدس کا بڑا خیال رکھا جانے لگا۔ اسے دیوتاؤں کی زبان کہنے لگے اس طرح اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا داخلہ سختی سے بند کر دیا گیا اور اس طرح یہ عوام کی پھیلتی اور آگے بڑھتی زبان سے کٹ کر رہ گئی اس طرح یہ بتدریج عوام کے لئے ایک غیر مفید بلکہ اجنبی سی شے بن گئی: نیچ ذات کے لوگوں کو اسے سننے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس طرح ایک زمانہ وہ آیا کہ مردہ زبانوں میں شامل ہو گئی اور ایک علاقائی بولی "پالی" نے آگے بڑھ کر اس کی جگہ لے لی۔

اودیچیہ: آریہ ہندوستان میں دریائے سندھ کو عبور کر کے آئے تھے اس لئے سب سے پہلے انھوں نے شمال مغربی ہندوستان (موجودہ سرحد، سندھ، پنجاب وغیرہ) میں رہنے والوں کو شکستیں دیں اور یہاں کے مقامی باشندوں کو آگے دھکیل کر خود یہیں رہنے لگے اس کے

بعد آریوں نے بتدریج سارا ہندوستان فتح کر لیا اور وہ پنجاب سے بنگال تک پھیل گئے۔ مگر اس طرح وہ جوں جوں شمال مغربی ہندوستان سے مشرقی ہندوستان کو بڑھتے گئے۔ ان کی زبان میں علاقائی زبانوں اور بولیوں کے اثرات شامل ہو گئے تھے۔ جس سے ان کی زبان میں طرح طرح کی تبدیلیاں آتی گئیں اور یہ تبدیلیاں مشرقی ہندوستان یعنی بہار میں زیادہ واضح تھیں لیکن ابھی ان کا مرکز شمال مغربی ہندوستان ہی تھا اور آریوں کی یہاں کی اپنی قدیم معیاری زبان کے قریب تر تھی اور سب لوگ اسی زبان سے سند لیتے تھے۔ یہی وہ زبان ہے جسے لسانیات "اودیچہ" کہتے ہیں۔ اودیچہ کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں "ر" اور "ل" دونوں آوازوں کے لئے صرف "ر" کی آواز مستعمل تھی۔

۳۔ مدھ دیشیہ: جب آریوں نے شمال مغربی ہندوستان کو فتح کر کے اپنے قدم آگے بڑھائے تو وہ اپنی قدیم معیاری زبان کو جوں کا توں نہ رکھ سکے اور اسے علاقائی زبانوں کے اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ مدھ دیشیہ اس زمانہ کی اس زبان کا نام ہے جو انبالہ سے الہ آباد تک کے علاقہ میں بولی جاتی تھی مگر اس زبان کے متعلق ابھی ایسا مواد نہیں مل سکا جس سے اس پر کوئی تفصیلی بحث ہو سکے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ زبان نہ تو شمال مغربی ہندوستان کی "اودیچہ" کی طرح مستند سمجھی جاتی تھی اور نہ مشرقی ہندوستان (بہار وغیرہ) کی زبان کی طرح پست اور ذلیل۔ لیکن اس علاقہ کی زبان کی یہ حالت ہمیشہ کے لئے قائم نہ رہ سکی، کیونکہ آریوں نے جب شمالی ہندوستان کا علاقہ (پنجاب سے بنگال) اپنے قبضہ میں کر لیا تو ان کا مرکز پنجاب سے اٹھ کر وسطی ہندوستان یعنی دوآبہ گنگا جمنا کا علاقہ قرار پایا اور اب یہاں کی زبان سارے ملک کے لئے معیاری اور مستند سمجھی جانے لگی۔ اس زمانہ میں "ر" اور "ل" دونوں آوازوں کے لئے علیحدہ علیحدہ لفظ یعنی "ر" اور "ل" بولے اور استعمال ہوتے تھے۔

۴۔ پراچیہ: اودیچہ اور مدھ دیشیہ زبانوں کی طرح پراچیہ بھی اس عہد کی مشرقی ہندوستان کی زبان تھی جو موجودہ اودھ، مشرقی یوپی اور مغربی بہار کے علاقہ میں آباد پراچیہ آریوں کے ان قبائل کی زبان تھی جب کہ آریہ سارے شمالی ہند پر قابض ہو چکے تھے یہ زبان دیسی زبانوں اور بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لب ولہجہ کسی حد تک کھو چکی تھی۔ مغربی ہندوستان میں بسنے والے آریہ پراچیہ زبان اور اسے بولنے والے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انھیں

غیر مہذب اور بھوت پریت کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ لوگ سنسکرت کو توڑ مروڑ کر کہتے تھے۔ پراچیہ زبان میں "ر" کی آواز "ل" میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

۵۔ پراکرت: جب سنسکرت اپنے عروج پر پہنچ گئی تو رفتہ رفتہ اس کا رواج کم ہونے لگا۔ ایسا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ زبان مذہب اور ادب کی ہو کر رہ گئی اور عوام کی بول چال سے دور ہوتی گئی۔ اب یہ عوام کی نہیں بلکہ مذہبی علماء، ادباء اور شعراء یعنی خواص کی زبان بن گئی اور روزمرہ استعمال سے دور ہو گئی۔

سنسکرت کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جو جین مت کے بانی مہاویر سوامی اور بدھ مت کے بانی مہاتما بدھ کی کوششوں سے ہندوستان میں نمودار ہوا۔ دونوں نے اپنے اپنے دھرم کی تبلیغ سنسکرت کی بجائے اپنے اپنے یہاں کی مقامی بولی میں کی یہ عوام کی بولیاں تھیں اور وہ انھیں بخوبی جانتے، سمجھتے اور تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے۔ لہذا انھوں نے اپنے اپنے علاقہ میں اپنی اپنی بولی کا خوشی سے استقبال کیا۔ اس طرح مذہب کا سہارا لے کر صوبائی بولیاں چمک اٹھیں۔ اور سنسکرت سے ٹکر لینے لگیں۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر ویدک مذہب کے علمبردار یعنی سنسکرت بولنے والے برہمن، کشتری وغیرہ اپنی زبان سنسکرت کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے یعنی انھوں نے سنسکرت کے علاوہ دوسری بولیوں کے الفاظ اور لب ولہجہ کے لئے سنسکرت کے دروازے سختی سے بند کر دیئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ سنسکرت ایک فرقہ کی زبان بن گئی۔ سنسکرت کے زوال کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ ویدوں کی زبان سنسکرت تھوڑی بہت منظم ہونے کے باوجود اتنی ٹھوس اور جامد نہیں تھی جتنی کہ ادبی سنسکرت۔ ادبی سنسکرت نے اپنے لئے "دیوتاؤں کی زبان" کا نام تو پالیا مگر وہ عوام سے دور سے دور تر ہوتی گئی، حتیٰ کہ عوام نے اس کے بدلے علاقائی بولیوں کو اختیار کر لیا۔ یہی وہ بولیاں تھیں جنھوں نے زبان کے فطری رجحان کے مطابق عام مستعمل الفاظ کو اپنے میں سمو لیا، یہی ان کے "پراکرت" یعنی فطری کہلانے کا سبب ہے۔ مختلف علاقوں کی بولیاں مختلف پراکرتیں کہلاتی تھیں یعنی ایک علاقہ کی بولی کے ساتھ "پراکرت" کا لفظ شامل کر کے اس کا نام بنتا تھا۔ پراکرت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ آریہ سنسکرت زبان بولتے تھے مگر ہندوستان کے غیر آریہ سنسکرت نہیں

بول نہیں سکتے تھے وہ اپنے اپنے علاقوں کی بولی میں سنسکرت کے الفاظ ملا کر بولتے تھے۔ پھر ان بولیوں ہی نے پراکرت کا نام پایا۔ گویا ہر علاقہ کی اپنی جداگانہ پراکرت تھی۔

لسانی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شروع ہی سے عوام کی زبان ایک مخلوط زبان تھی ایک ایسی زبان جس میں آریوں کی ابتدائی زبان اور دیسی بولیاں دونوں کا میل تھا۔ بعض لوگوں نے اسی کو "پراکرت" کہا ہے اور ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت دونوں کی ماں مانا ہے مگر ہم اسے پراکرت نہیں بلکہ "ابتدائی زبان" کے نام سے یاد کریں گے اور پہلی پراکرت صرف زبان کو کہیں گے جس کا ادبی روپ پالی ہے۔ پراکرت کے سب سے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا پھر راجہ اشوک (۲۵۰ ق م) کی لاٹوں پر کندہ کئے ہوئے ملتے ہیں ہم اسی کو پہلی پراکرت ماننے پر مجبور ہیں۔ پراکرت کی اسی ادبی شکل کو پالی کے نام سے یاد کیا گیا ہے، مگر پراکرت کا یہ نام اس وقت پڑا جب اس نے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس پر شورسینی[1] پراکرت[2] کا پورا پورا اثر پڑ چکا تھا۔

۶۔ مہاراشٹری: جب سنسکرت کی جگہ لینے والی بولیاں (پراکرتیں) بھی ادبی زبان بن کر عوام کے بول چال سے دور ہو گئیں تو ان کی جگہ لینے کے لئے دوسری عوامی بولیاں آگے بڑھیں ان میں مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، اردھ ماگدھی اور پشاچی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان نئی پراکرتوں کا زمانہ ۵۰۰ ق م سے ۶۰۰ عیسوی تک کا ہے۔

مہاراشٹری پراکرت علاقہ مہاراشٹر میں بولی جاتی تھی۔ ادبی حیثیت سے اس زمانہ میں مہاراشٹری کو سب سے زیادہ عروج حاصل تھا۔ عہد پراکرت کے قواعد نویسوں نے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے بلکہ اسے اس عہد کی معیاری زبان کا نمونہ مانا ہے۔ دوسری پراکرتوں کا سرسری ذکر کر دینے کے بعد ہمیشہ یہ لکھ دیا ہے کہ باقی سب باتوں میں یہ مہاراشٹری سے ملتی جلتی ہے اس عہد کا بیشتر شعری ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ موسیقی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ حروف علت کی کثرت کی وجہ سے اس میں لوچ زیادہ تھا

---

[1] شورسین: متھرا اور اس کے ارد گرد کا علاقہ

[2] شورسینی پراکرت: متھرا اور اس کے گرد و نواح میں ۵۰۰ ق م سے ۶۰۰ عیسوی تک بولی جانے والی زبان

آج بھی مہاراشٹری سنگیت عمدہ مانا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لفظ مہاراشٹر سے اکثر ملک ہندوستان مراد لی جانے لگی۔

ڈاکٹر چیٹرجی نے ڈاکٹر من موہن گھوش کی ایک تصنیف کے حوالہ سے مہاراشٹری پراکرت کی علیحدہ حیثیت ماننے سے انکار کر دیا ہے ان کے خیال میں مہاراشٹری کی نسبت ملک مہاراشٹر سے نہیں، بلکہ وہ شورسینی پراکرت کی ایک شستہ اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

۷۔ ماگدھی: ماگدھی مگدھ دیس یعنی جنوبی بہار کی ۵۰۰ ق م سے ۲۰۰ عیسوی تک کے عرصہ میں بولی جانے والی پراکرت تھی۔ چونکہ یہ آریائی تمدن کے مراکز سے کافی دور جا پڑی تھی اس لئے یہ ایک غیر مہذب اور ناشستہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ ماگدھی پراکرت اس وقت آریائی زبان کے پھیلاؤ کی مشرق میں آخری حد تھی بعض مصنفوں نے اس پراکرت کو پالی سے خلط ملط کر دیا ہے حالانکہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ پالی کا یہ نام یعنی ماگدھی سب سے پہلے سیلون کے بدھوں میں پڑا، جو ہندوستانی زبانوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے۔

۸۔ شورسینی: شورسینی پراکرت کا مرکز شورسین دیس دوآبہ گنگا جمنا تھا۔ اعلیٰ طبقہ میں سنسکرت کے بعد اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو شورسینی تھی۔ اس پر سنسکرت کی گہری چھاپ تھی۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی شورسینی کی ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔ دراصل متھرا یعنی دوآبہ گنگا جمنا ہی وہ علاقہ ہے۔ جہاں سنسکرت اور شورسینی پراکرت دونوں پروان چڑھتی ہیں۔ اس لئے دونوں میں نہایت قریب کا تعلق نظر آتا ہے شورسینی پراکرت نے عیسوی سن کے آغاز سے پہلے ہی مسلم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

۹۔ اردھ ماگدھی: شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی علاقے یعنی بہار سے الہ آباد تک میں اردھ[۱] ماگدھی پراکرت بولی جاتی تھی۔ آج جس علاقہ کو دلّی والے پورب کے نام سے پکارتے تھے، مغربی ہندوستان کے لوگ اس وقت اسے "پراچیہ" کہا کرتے تھے "پراچیہ" کے تحت ماگدھی اور اردھ ماگدھی دونوں آجاتی تھیں۔ ان دونوں میں اردھ ماگدھی کو فروغ حاصل تھا۔ گوتم بدھ اور مہاویر دونوں نے اسی (اردھ ماگدھی) کی قدیم شکل میں اپنے اپنے دھرم

---

[۱] اردھ۔ نصف

کا پرچار کیا۔ اس کا رواج اس زمانہ کے شاہی خاندانوں تک میں تھا۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر اثر انداز بھی ہوئی۔ تاریخ سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ دوآبہ گنگا، جمنا کے رہنے والوں کو اس وقت مشرق کی اس پراکرت (اردھ ماگدھی) کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ یہ اس وقت کی معیاری زبان تھی۔ آج کل کی مشرقی ہندی یعنی پوربی کی بناوٹ پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف یہ موجودہ بہاری اور دوسری طرف مغربی ہندی یعنی دوآبہ گنگا جمنا کی زبان کی آمیزش سے بنی ہوگی۔

۱۰۔ اپ بھرنش : جب سنسکرت نے اپنے آپ کو مذہب اور ادب کے لئے مخصوص کر دیا اور عوام کی بول چال سے دور ہٹ گئی تو پراکرتوں نے جنم لیا۔ اور جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کی، تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھا اور بڑھتا رہا۔ اسی عوامی بول چال کی زبانوں کو اس عہد (۶۰۰ عیسوی تا ۱۰۰۰ عیسوی) کے قواعد نویسوں نے "اپ بھرنش" کہا ہے۔ بھاملہ اور دنڈی کے تذکروں اور ولبھی کے راجہ دہرسین کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں اپ بھرنش تحریر میں استعمال ہونے لگی تھی مگر بعض لوگوں کے نزدیک تو دوسری یا تیسری صدی عیسوی ہی سے اس کی جھلکیاں پراکرت کے روپ میں ملتی ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اپ بھرنش کے بیج دوسری صدی کی پراکرت میں مل جائیں لیکن یہ پروان چھٹی صدی عیسوی میں جا کر چڑھتی ہے۔ ہندوستان کی جدید زبانوں (جن میں اردو بھی شامل ہے) کے طلوع کا زمانہ ۱۰۰۰ عیسوی مقرر کیا گیا ہے لیکن اپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی صدی عیسوی سے لے کر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی تک میں ملتا ہے۔

شروع شروع میں لفظ "اپ بھرنش" کسی خاص زبان کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ ان پڑھوں کی زبان کو "اپ بھرنش" یا "اپ بھاشا" کہا کرتے تھے اس سے ان کی مراد وہ زبان ہوتی تھی جس میں سنسکرت کے اصل الفاظ کے بجائے اس کے بگڑے ہوئے لفظوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ آریہ لوگ اپنی زبان کے سلسلہ میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ اسی لئے سنسکرت میں اپ بھرنش کے لئے "ملیچھ" یعنی ناپاک کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے

اپ بھرنش[1] کو ملک کی زندہ اور عام استعمال کی زبان پاکر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ یورپ کی زبان تک نے اس کے اثر کو قبول کیا، لیکن گجرات، راجپوتانہ اور دوآبہ گنگا جمنا میں بولی جانے والی بولیوں پر اس کی چھاپ گہری پڑی۔ چنانچہ ۸۰۰ عیسوی سے ۱۰۰۰ عیسوی تک دوآبہ کی شورسینی اپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تھی۔ اس کا بہت بڑا سبب اس زمانہ میں راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا جس کا دارالسلطنت اس وقت گنگا کے علاقہ میں شہر قنوج تھا۔

پراکرت کے بڑے عالم مارکنڈے نے اپ بھرنش کی تین قسمیں بتائی ہیں:

۱۔ ناگر اپ بھرنش: یہ گجراتی اور راجستھانی کی قدیم بولیوں کی ادبی شکل تھی۔ لیکن اس پر شورسینی کا اس قدر اثر پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ اس اپ بھرنش کو فوقیت اس لئے حاصل تھی کہ یہ علمی طبقہ میں مقبول تھی۔

۲۔ پراچڈ اپ بھرنش: یہ سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے۔

۳۔ اُپ ناگر اپ بھرنش: یہ ناگر اور پراچڈ کے میل سے بنی ہے اور اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب[2] میں تھا۔

---

[1] اپ بھرنش یعنی بگڑی یا گری پڑی زبان [2] بقول ڈاکٹر مسعود حسن خان شورسینی اپ بھرنش نے ہی اردو کو جنم دیا۔

اردو کی ابتدا کے متعلق نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ بیان کیجئے:

اردو کی ابتدا کے متعلق نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ اس کی ابتدا دکن سے نہیں بلکہ دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی۔ اپنی اس بات کو اس طرح سے بیان کیا ہے: جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ رہتی سہتی اور لین دین کرتی ہے تو لازمی طور پر بول چال اور کام کاج میں ایک کی زبان کے الفاظ دوسرے کی زبان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اب یہ بات کسی مزید وضاحت کی محتاج نہیں کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی۔ اس لئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ یا دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا، کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان مقامات پر ہوئی تھی۔ سندھ کی اسلامی حکومت کا آغاز ۹۲ھ یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کا ہندوؤں سے سلوک بہت عمدہ تھا۔ اس لئے ہندو اور مسلمان آپس میں بڑے خلوص اور پیار سے رہتے تھے۔ باہمی میل جول سے تبادلہ خیالات ہر موقع پر ہر گھڑی اور ہر جگہ ہوتا رہتا تھا اور دونوں قوموں نے ایک دوسرے کی زبان کو کم از کم اپنی ضروریات کی خاطر سمجھنے کی کوشش کی ہوگی۔ ان حالات میں اگر یہ کہا جائے کہ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی تو یہ بات قدرتی اور صحیح معلوم ہوتی ہے مگر جدید تحقیقات کے مطابق یہ نتیجہ درست نہیں ہے۔ لیکن مسلمان فاتحوں کی اصل زبان عربی تھی اس لحاظ سے جو زبان عالم وجود میں آئی، وہ عربی اور شورسینی[1] کے اشتراک سے بنتی، مگر چونکہ اس میں فارسی الفاظ کا حصہ بہت زیادہ ہے، اس لئے ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی۔ سندھ کے بعد مسلمان کی آمد مالابار اور کرناٹک کے ساحل پر ہوئی۔ یہ مسلمان تجارت کی غرض سے سمندر کا سینکڑوں میل کا راستہ طے کر کے وہاں پہنچے اور اپنی کوششوں اور اعلے اخلاق کی وجہ سے ان ساحلی علاقوں کے ہندوؤں میں خاص اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ اور ساحلوں سے گذر کر ملک کے اندر دور دور تک جاکر بس گئے وہاں انھوں نے اپنی مسجدیں تعمیر کیں

---

[1] اس وقت شورسینی زبان سارے شمالی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی

اپنی حکومتیں قائم کیں اپنے مذہب کی اشاعت کی اور اپنی تعلیم کی تلقین کی۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس طرح باہمی میل جول سے ایک نئی زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ مگر جو وجوہ سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے سے مانع ہیں وہی وجوہ یہاں بھی مانع آتے ہیں۔ یعنی ان مسلمانوں کی زبان عربی تھی۔ مگر اردو میں فارسی زبان کے الفاظ کی کثرت ہے اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی ابتدا دکن سے بھی نہیں ہوئی۔ اردو کے پنجاب سے پیدا ہونے کے متعلق مولانا محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اس سے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جب تک مسعود کا ہندی دیوان نہیں مل جاتا ان کی تحقیق کو صحیح نہیں کہا جا سکتا اور جیسا کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری کی رائے ہے پنجابی زبان اردو کی ماں نہیں ہو سکتی بلکہ بہن ہو سکتی ہے اردو کی ابتدا کے متعلق سندھ دکن اور پنجاب کے دعوے غلط ثابت ہو جانے کے بعد اب صرف دوآبہ گنگا جمنا باقی رہتا ہے جو اردو کی جائے پیدائش ہونے کا دعویدار ہو سکتا ہے۔

موجودہ ماہرین لسانیات کی تحقیق کے مطابق اردو کا سرچشمہ وہ زبان ہے جو پنجابی اور برج دونوں کی ماں تھی یعنی وہ پراکرت زبان جو مسلمانوں کی آمد کے وقت پشاور سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔ مسلمان فاتحین نے شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوتے تو پہلے تو انھوں نے پنجاب میں قیام کیا مگر ۱۱۹۳ء میں دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک اور افغان تھے اور جن کی زبان عام طور پر فارسی تھی پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اس زمانہ میں یہاں "جدید ہند آریہ دور کی پراکرت" یعنی کھڑی بولی لوگ بولتے تھے۔ اس دیس میں دیسی زبان اور مسلمانوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی لہذا اس کی جائے پیدائش دوآبہ گنگا جمنا کا علاقہ ٹھہرتا ہے۔

دکن میں اردو کی ابتدا اور اسکی نشو ونما کے متعلق نصیر الدین ہاشمی کی رائے تحریر کیجیے:

اردو دکن میں پیدا نہیں ہوئی بلکہ یہ شمالی ہندوستان کے فاتحین کے ذریعہ وہاں پہنچی اور پھر وہاں خوب پھولی پھلی۔ مسلمانوں نے دہلی فتح کرنے اور وہاں اپنے مضبوطی سے پاؤں جمانے کے بعد جنوبی ہندوستان یعنی دکن کا رخ کیا۔ پہلے علاؤالدین نے دکنی علاقے فتح کئے اور پھر ملک کافور نے دکن پر مسلسل حملے کئے اور ۱۳۱۰ء تک یہ فاتح راس کماری تک پہنچ گئے۔ ان کے بعد جب محمد تغلق نے اپنا دارالحکومت دہلی سے دولت آباد منتقل کیا تو دہلی اور اس کے گرد و نواح کی چار چار میل کے اندر کی بستیوں کے تمام چھوٹے بڑے اور ہر پیشہ کے لوگ دولت آباد جا بسے کچھ عرصہ بعد محمد تغلق دہلی واپس چلا گیا مگر ہجرت کر کے جانے والوں کی اکثریت دولت آباد ہی میں رہ پڑی۔ ان سارے حملہ آوروں اور دوسرے مہاجرین کی زبان وہی تھی جو اس وقت تقریباً سارے شمالی ہندوستان یعنی بنگال سے لے کر پشاور اور سندھ تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اسی زبان نے بعد میں بعد میں اردو کا نام پایا۔ دکن میں ان لوگوں کی زبان کے مقابلہ میں دوسری کوئی نہ آئی اور یہ وہاں آزادانہ نشو ونما پانے لگی اور چونکہ اسے وہاں جلد ہی سرکاری اور درباری زبان ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ اس لئے ادباء و شعراء سب اسی میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے اور یہ زبان تیزی سے وہاں ترقی کرنے لگی اگرچہ اس زمانہ میں شمالی ہندوستان میں اس زبان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی اور لوگ فارسی ہی میں اظہار خیال کرنے میں اپنا کمال اور فخر محسوس کرتے تھے مگر دکن میں ساری توجہ صرف اردو ہی کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

اس وقت دکن میں اردو کو دکھنی کہتے تھے۔ اس زبان کو پہلے بہمنی خاندان نے سرکاری و درباری زبان قرار دے کر اس کی جی بھر کر سرپرستی کی اور اس طرح دکن میں نظم و نثر کی جاندار اور پر مغز ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد قطب شاہیہ اور عادل شاہیہ خاندانوں کی شاہی سرپرستی اسے حاصل ہوئی جو ۱۶۸۶ء اور ۱۶۸۷ء تک جاری رہی حتیٰ کہ شہنشاہ

اورنگ زیب نے حملہ کرکے قطب شاہیہ اور عادل شاہیہ حکومتوں کو ختم کرکے مغلیہ سلطنت کا حصہ بنالیا۔ ان ہر دو حکومتوں نے بھی اردو کی بے مثل خدمت کی۔ مغلیہ فتوحات کے بعد اردو زبان و ادب کو دکن میں پہلے جیسے سرپرست تو نہ رہے، مگر پھر بھی اردو آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ اسی (مغلیہ) دور ہی میں دکن نے ولیؔ اورنگ آبادی جیسا عظیم اردو شاعر پیدا کیا۔ اور یہی وہ شاعر ہے جس نے دکن سے دہلی جاکر اپنے کلام کے ذریعہ اہل دہلی کو یہ بتایا کہ اردو زبان ترقی کے کتنے زینے طے کرچکی ہے۔ اور اس پر اہل دہلی یعنی دوآبہ گنگا جمنا کے لوگ بھی اردو میں نظم و نثر پیدا کرنے لگے۔

اُردو کی اصل اور اس کی ابتداء

لسانیات میں زبانوں کی تقسیم یوں بھی کی جاتی ہے کہ ایک وہ زبانیں ہیں جو قدیم ہیں اور جن میں سے کسی ایک زبان کی ابتداء کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ قدیم زبانیں مختلف گروہوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ان میں سے مشہور گروہ درج ذیل ہیں :۔

۱۔ آریائی گروہ کی زبانیں :

سنسکرت، لاطینی، یونانی ، قدیم فارسی وغیرہ۔

۲۔ سامی گروہ کی زبانیں :

عربی ، عبرانی ، سریانی ، اشوری وغیرہ۔

۳۔ دراوڑی گروہ کی زبانیں :

تامل ، تلگو ، کنڑی وغیرہ۔

۴۔ تورانی گروہ کی زبانیں :

ترکی ،

اس لحاظ سے زبانوں کی دوسری قسم وہ ہے جسے فروعی یعنی جدید زبانیں کہا جاتا ہے۔ ان میں کی ہر زبان کسی نہ کسی قدیم زبان سے نکلی ہے۔ ہمارے ہاں اردو ، پنجابی ، سندھی وغیرہ ایسی ہی زبانیں ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کہتا ہے[1] کہ اگر کسی دنئی زبان کا منبع یعنی اصل جاننا ہو، تو اس کے لئے اس زبان کے سب الفاظ صحیح رہنمائی نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس زبان کے اصوات و اصولوں اس کی بنیادی آوازوں (مادوں)، اور صرفی و نحوی اصولوں کو دیکھنا اور پرکھنا چاہیئے کہ وہ کس زبان کے ہیں اور آس پاس کی کس قدیم اصلی زبان کے بنیادی سرمائے سے ماخوذ ہیں۔

اس اعتبار سے کسی زبان کی اصل اور ماخوذ دریافت کرنے کے لئے اس زبان کے

---

[1] اردو لسانیات ــــــ ڈاکٹر شوکت سبزواری

ذخیرۂ الفاظ میں سے صرف الفاظ عامہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یا الفاظ عامہ کے علاوہ اس کی بنیادی آوازوں یعنی مادوں اور صرفی و نحوی قاعدوں کو جانچا جاتا ہے جو زبان کا ڈھانچا یا پیکر ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو ہی کو لیجئے۔ اس کے سرمایہ الفاظ میں عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی، تلگو، گجراتی، فرانسیسی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ ان میں سے عربی سامی خاندان کی زبان ہے، فارسی کا تعلق ہند ایرانی سے ہے، ترکی تورانی قبیلے کی ہے۔ تلگو دراوڑی ہے، انگریزی ٹیوٹانی ہے اور فرانسیسی اور پرتگالی لاطینی ہیں۔ اب اگر ان الفاظ کو بنیاد بنا کر اردو زبان کی اصلیت اور اس کے ماخذ کا کھوج لگائیں تو ظاہر ہے کہ اردو زبان کے ماخذوں اور اصل کا تعلق ان مذکورہ بالا تمام زبانوں سے تعلق نہیں قائم کیا جا سکے گا۔

اردو زبان کے سرمایۂ الفاظ کو لے کر اس کی اصل کا سراغ لگانا بے سود بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ اس طرح کی تلاش کی وجہ سے بڑے سے بڑا عالم بھی غلط راہ پر چل نکلے گا۔ ڈاکٹر گریرسن اور ہیورنلے کو بھی یہی پیش آیا۔ اول اول ان عالموں نے اردو کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ اس کی اصل پاک و ہند کی کوئی خاص زبان نہیں، بلکہ یہ کئی زبانوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ہیورنلے نے لکھا:

"اردو مقابلتہً حال کی پیداوار ہے۔ یہ دہلی کے نواح میں، جو مسلم اقتدار کا مرکز اور برج، مارواڑی، پنجابی کا سنگم تھا، بارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے میل جول سے ایک ملی جلی زبان (اردو) وجود میں آئی، جو صرفی و نحوی حد تک برج ہے، اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی اور عربی۔"

ڈاکٹر گریرسن نے ڈاکٹر ہیورنلے کی رائے پر یوں حاشیہ چڑھایا:

"اردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط، عام اور مشترک

حا: گوڈین زبانوں کی گرامر ص ۶۱/ ۷

زبان ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی اور تلگو زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اس کے صرفی و نحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولیوں سے خوشہ چینی کی ہے، اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پاکر بنی ہے۔"[1]

۱۹۰۰ء کے قریب پاک و ہند کی زبانوں کا لسانیاتی جائزہ لیا گیا اور اردو کا صرفی و نحوی تجزیاتی مطالعہ ہوا تو ان کی آنکھیں کھلیں، اور گریرسن نے صحیح عالمانہ جذبے کے تحت اپنی مذکورہ بالا غلطی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"ہندوستانی (اردو) کے آغاز کے بارے میں آج تک اہلِ علم نے (جن میں خود بھی شامل ہوں) جو کچھ لکھا، میر امن (دہلوی) کے دیباچہ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میر امن کے بیان کے مطابق اردو ان مختلف لوگوں کی بولیوں کا معجونِ مرکب ہے جو دہلی کے بازاروں میں جمع ہو گئے تھے۔ اس غلط فہمی کو اول اول سر چارلس لائل نے ۱۸۸۰ء میں دور کیا اور اب ہندوستانی (پاک و ہند کی) زبانوں کے تفصیلی لسانیاتی جائزہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبہ (گنگا جمنا) اور مغربی روہیل کھنڈ کی (بول چال کی) زبان ہے۔ اُن گھڑ اور گنوارو الفاظ و محاورات نکال کر اسے ادبی نکھار سنگھار دے دیا گیا۔"[2]

مذکورہ بالا بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو کی اصل پاک و ہند کی ایک قدیم مخصوص اور متعین زبان ہے جس سے ترقی پاکر اردو وجود میں آئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کونسی زبان ہے اور پاک و ہند کے کس علاقہ میں بولی جاتی تھی؟

ڈاکٹر گریرسن، جولز بلاک، چٹرجی اور دیگر ماہرینِ لسانیات اردو کے گہرے تجزیاتی

ح۱:- کلکتہ ریویو جلد ۷، صفحہ ۱۵۶

ح۲:- ہندوستانی لسانیات کا جائزہ، جلد ۹، حصہ ۱، حاشیہ صفحہ ۱۴۲

مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش ہے جو آج سے تقریباً پندرہ سو سال پہلے دوآبہ گنگا جمنا کے بالائی حصہ میں بولی جاتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو کے موجودہ خط و خال شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش سے بہت ملتے ہیں اور اردو میں اور ان زبانوں (شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش) میں نہایت درجہ کی بنیادی مشابہتیں ہیں، لیکن اردو اصوات و اصول کا ایک بہت بڑا سرمایہ ایسا ہے جو غائر تقابلی مطالعہ کے بعد ان زبانوں (شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش) یا یوں کہئے کہ ان زبانوں کے ان روپوں سے جن کا ذکر ہیم چندر اور دوسرے قواعد نویسوں نے کیا ہے، ماخوذ نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب اردو لسانیات میں کہتا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو پراکرت سے ماخوذ ہے، لیکن یہ پراکرت وہ نہیں جس کے قواعد ہیم چندر یا دوسرے قواعد نویسوں نے لکھے ہیں۔ بلکہ میرا (شوکت سبزواری کا) خیال ہے کہ اردو نے جس پراکرت سے ارتقاد پایا وہ وہ بول چال کی زبان تھی جو شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش سے پہلے یا ان زبانوں کے پہلو بہ پہلو دوآبہ کے بالائی حصہ میں بولی جاتی تھی۔ پالی، شورسینی، مغربی اپ بھرنش اس بول چال کی پراکرت کے نکھرے ہوئے ادبی روپ ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مذکورہ بالا خیال کے مطابق اردو اور پالی، شورسینی، مغربی اپ بھرنش کا سلسلہ ایک ہی پراکرت سے چلتا ہے۔ لیکن کیونکہ یہ پراکرت بول چال تک محدود رہی اس لئے اس کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے اور اسی لئے آج ہمیں اس کے خط و خال اجاگر کرنے میں وقت پیش آتی ہے۔

بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کی اصل متعین ہو جانے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اردو کس زمانہ میں اپنی اصل سے بچھڑی اور کب اس نے اصل زبان سے مختلف یا موجودہ روپ اختیار کیا؟

یہاں پر ہمارے سامنے ایک مشکل منزل آتی ہے یعنی اردو کی قدیم تحریری دستاویزوں کا فقدان۔ ہمیں اردو کے قدیم بے میل (خالص) مستند تحریری نمونے نہیں ملتے۔ اگرچہ

"پرتھوی راج راسا" ایک قدیم تحریری دستاویز ہے، لیکن یہ بے میل (خالص) نہیں۔ اس کی زبان کو خالص قدیم اردو نہیں کہا جا سکتا۔ امیر خسرو کی طرف جو ریختہ[1] منسوب ہے وہ قدیم نہیں بلکہ چودھویں صدی عیسوی کا ہے اور مستند بھی نہیں۔ اس کے علاوہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ امیر خسرو کا ہے اور اگر اسے امیر خسرو کا کلام مان بھی لیا جائے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ دست برد زمانہ سے محفوظ رہا اور یہ اسی حالت میں ہم تک پہنچا ہے جس میں امیر خسرو نے پیش کیا تھا۔ یہ کلام سینہ بہ سینہ زبانوں پر منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ اس لئے اس کا امکان ہے کہ رائج زمانہ اور محاورے کے مطابق اس میں حسب ضرورت ردوبدل ہوتا رہا ہو۔ اس لئے یہاں ہمیں[2] زیادہ تر قیاس یا کٹی پھٹی، منتشر، ادھر ادھر بکھری ہوئی شہادتوں سے کام لے کر فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اردو کس زمانہ میں اپنی اصل سے بچھڑی۔

ماہرین لسانیات، جنھوں نے پاک و ہند کی قدیم و جدید آریائی زبانوں پر تحقیقی کام کیا ہے، گیارھویں صدی عیسوی کو جدید ہند آرائی زبانوں (جن میں اردو بھی شامل ہے) کے ابھرنے کا زمانہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں پاک و ہند کی زبانوں نے اپنی اپنی اپ بھرنشوں سے ۱۰۰۰ء کے الگ بھگ ابھر کر یا یوں کہئے کہ بچھڑ کر موجودہ شکل اختیار کی۔ یہی زمانہ اردو کے ابھار کا ہے۔ اردو نے بھی (اس کا نام اردو بعد میں پڑا) ۱۰۰۰ء کے بعد اپنا قدیم چولا بدلا اور آہستہ آہستہ اس کے موجودہ خط و خال نمایاں ہوئے۔ ابھی وہ (اردو) پوری طرح ابھرنے بھی نہ پائی تھی کہ مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوگئے[3]۔ انھوں نے اس زبان کو نکھارا۔ ڈاکٹر بیلی ۱۱۹۳ء کو اردو کا یوم میلاد قرار دیتے ہیں، میں کہتا ہوں[4] کہ ۱۰۰۰ء اردو کے ابھار کا زمانہ ہے اور ۱۱۹۳ء نکھار کا۔ ۱۰۰۰ء میں اردو نے آنکھ کھولی اور ۱۱۹۳ء یعنی مسلمانوں کی فاتحانہ دہلی میں آمد کے بعد نشو و نما پا کر اس اس قابل ہوئی کہ لوگوں کو بطور ایک زبان اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

ح۱: اردو کا پرانا نام۔ ح۲: یہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی رائے ہے۔ ح۳: سلطان محمد غوری ۱۱۹۳ء میں دہلی فتح کی تھی۔ ح۴: شوکت سبزواری۔

اگرچہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتے لسانی مشابہتوں کی بنا پر طے کئے جاتے ہیں، لیکن رشتے کئی قسم کے ہوتے ہیں، ماں بیٹی، خالہ بھانجی کا رشتہ بہن بہن کا رشتہ۔ اس میں شک نہیں کہ دو زبانوں کی لسانی مشابہتیں یہ بتاتی ہیں کہ یہ دو زبانیں ایک دوسرے کی عزیز ہیں اور ان میں ایک رشتہ ہے۔ مگر یہ رشتہ کیا ہے؟ یہ نہیں معلوم ہوتا۔ رشتہ کی نوعیت متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان زبانوں کے ملتے جلتے سرمایہ میں سے جن کی بنا پر ان کے عزیز اور قریب ہونے کا فیصلہ کیا گیا، کس زبان کا سرمایہ قدیم ہے، یا ان دونوں زبانوں میں سے کس زبان کا سرمایہ ایسا ہے جو دوسری زبان کے سرمایہ سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی ایک زبان کا سرمایہ دوسری زبان کے سرمایہ سے زیادہ قدیم ہے، یا اس کا کچھ سرمایہ ایسا ہے جو دوسری زبان کے لسانی سرمایہ سے نہیں لیا جا سکتا، تو یہ زبان دوسری زبان کی بیٹی نہیں بہن ہوگی؛ اور یہ کہا جائے گا کہ یہ (دونوں) زبانیں کسی تیسری زبان سے ترقی پا کر وجود میں آئیں۔

پاک و ہند کی جدید زبانوں میں سے اردو زبان برج اور پنجابی سے بہت ملتی ہے۔ ان زبانوں میں گہری لسانی مشابہتیں ہیں، چنانچہ ان مشابہتوں سے فریب کھا کر ہی بعض اہل علم نے برج کو بعض نے پنجابی کو اردو کی اصل بتایا ہے۔ مگر اردو زبان کی اصل برج ہے اور نہ پنجابی۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ کبھی کوئی زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی، بلکہ یہ مدتوں بلکہ صدیوں آہستہ آہستہ اور بتدریج ایک نئی شکل اختیار کرتی رہتی ہے، اور جب یہ ذرا زیادہ واضح ہو جاتی ہے تو اسے زبان کی پیدائش یا ابھار کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ زبان ترقی کرتی اور پھلتی پھولتی ہے۔

اُردو زبان کا اِرتقا

زبان خلا میں پیدا نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ایک زبان دوسری زبان سے نکلتی ہے۔ یعنی ایک زبان دوسری زبان کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ زبان کا جنم لینا کیا ہے؟ ایک زبان حالات

کے تقاضوں کیمطابق بدل بدلا کر ایک نیا روپ اختیار کرلیتی ہے اور یہی زبان کا جنم لینا ہے۔ زبان برابر ادلتی بدلتی اور حالات کے مطابق نت نئے روپ دھارتی رہتی ہے۔ جب تک زبان کا بولنے والوں سے تعلق ہے۔ یعنی لوگ زبان کو بولنے کے لئے استعمال کرتے رہیں گے اس میں شکست وریخت اور ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ یہ دوسری زبانوں کی خراد پر ترشتی ترشاتی، چھلتی چھلاتی اور کٹ کٹا کر سڈول بنتی رہے گی۔ ایک زبان کا جب بولنے والوں سے تعلق قطع ہو جاتا ہے۔ پھر اس زبان پر جمود چھا جاتا ہے اور وہ مردہ زبانوں میں شامل ہو جاتی ہے، ردو بدل زبان کی زندگی ہے اور یہی اس کا ارتقا ہے، اس لئے زبان کا ارتقا کا ہی اس کی زندگی ہے۔

اردو زبان زندہ ہے۔ زندہ زبانوں کی طرح یہ نامعلوم زمانے سے ادلتے بدلتے ارتقا کی منزلیں طے کرتے اور زمانے کے بے کراں سمندر کی لہروں میں بہتے ہوئے ہم تک پہنچی ہے[1]۔

تقریباً پندرہ سو سال قبل مسیح میں آریہ قبائل ایک زبان بولتے ہوئے سرزمین پاک و ہند میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت اس زبان کا کوئی نام تھا یا نہیں، اگر تھا تو کیا تھا؟ آج یہ بتانا مشکل ہے، لیکن آجکل علم لسانیات کے ماہر فرق و امتیاز کے لئے اس زبان کو "قدیم ہند آریائی" کہتے ہیں۔ قدیم اس لئے کہ پاک و ہند میں زبان کی یہ قدیم ترین شکل ہے اور ہند آریائی اس لئے کہ یہ پاک و ہند کی آریائی نسل کی زبان ہے اس زبان کے قدیم ترین نمونے رگ وید میں ملتے ہیں۔

۱۰۰۰ ق۔ م سے ۵۰۰ ق م کے درمیان اس قدیم زبان میں معمول کے مطابق تغیرات رونما ہوئے اور اس نے حسب ذیل تین روپ اختیار کئے:

۱۔ اودیچیہ۔ شمالی (شمال مغربی) زبان۔

۲۔ پراچیہ۔ شرقی زبان۔

۳۔ مدھیہ دیشی[2]۔ وسطی علاقے (مشرق و مغرب کے درمیان کی) زبان۔

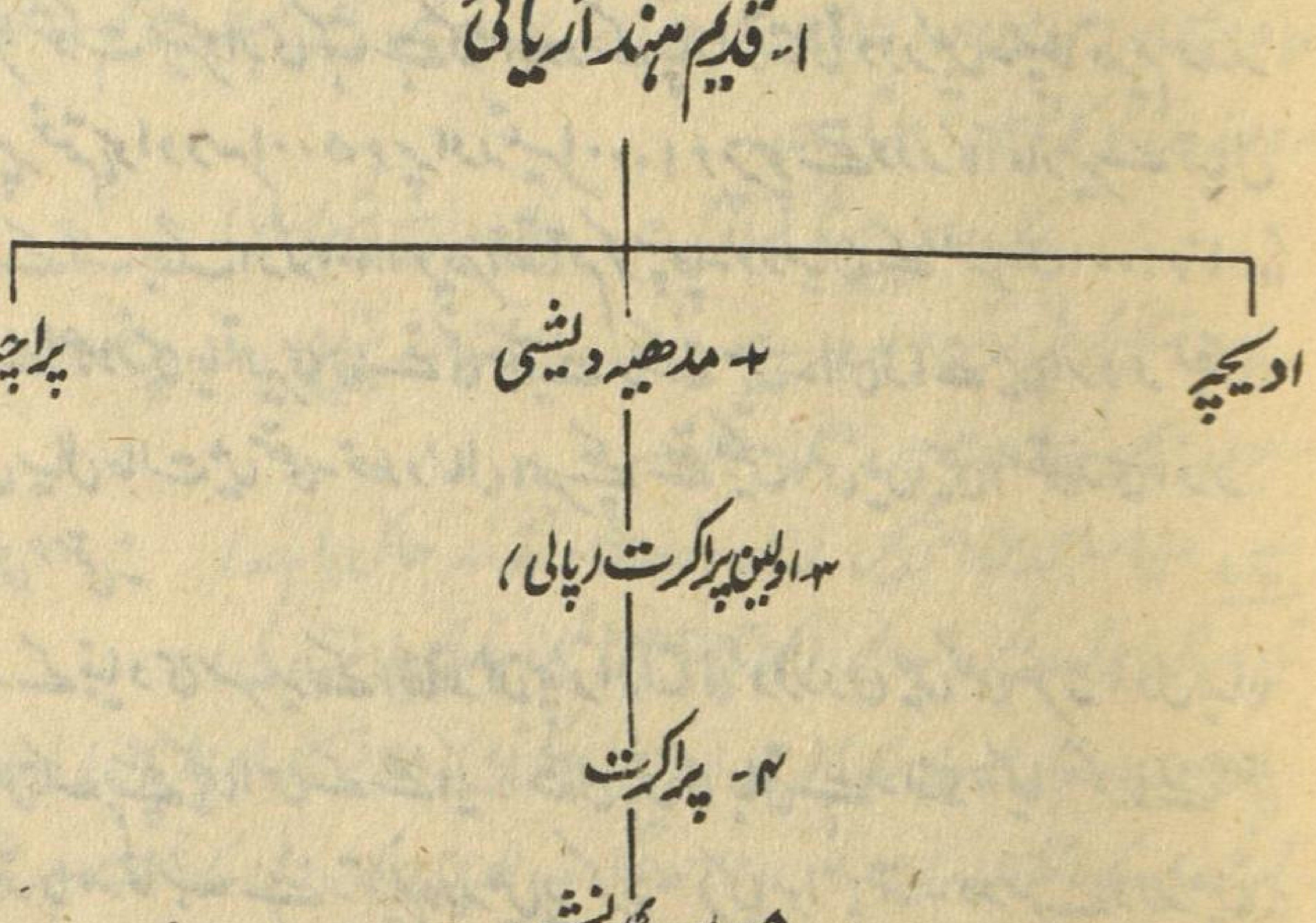
ح[1]:۔ اردو لسانیات از ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ ح[2] درمیانی علاقہ مراد ہے دوآبہ گنگا جمنا)

ان میں ادیچیہ یعنی شمال مغربی زبان کسی قدر قدامت پسند ہونے کی وجہ سے شستہ اور فصیح سمجھی جاتی تھی۔ یہ زبان قدیم ہند آریائی زبان سے مقابلتاً زیادہ قریب تھی۔

پراچیہ اودھ، بہار اور مشرقی یوپی کی زبان تھی۔ یہ اصل زبان (قدیم ہند آریائی) سے دور ہونے کی وجہ سے غیر فصیح سمجھی جاتی تھی۔

مدھیہ پردیش کی زبان ان دونوں کے بین بین تھی۔ اس میں تبدیلیاں ہوئیں لیکن مشرقی زبان کی نسبت سے کم اور غیر اہم۔

اردو مدھیہ دیش[1] کی اس قدیم زبان کی آخری کڑی ہے۔ مدھیہ دیش کی اس زبان کو اردو کا قدیم ترین روپ دھارنے سے پہلے تین ارتقائی دوروں سے گذرنا پڑا، جن میں ہر دور کم و بیش ۵۰۰ سال کا ہے۔ پہلا دور ۵۰۰ ق م سے شروع ہو کر ولادتِ مسیح (سنِ عیسوی کے آغاز) پر ختم ہوا۔ یہ پالی یا اولین پراکرت کا دور ہے۔ دوسرا دور سنِ عیسوی کے آغاز سے ۵۰۰ء پر اختتام کو پہنچا۔ اسے پراکرت دور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۵۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک کا دور اپ بھرنش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مدھیہ دیشی کی ان ارتقائی کڑیوں کو شجرہ نسب کی شکل میں اس طرح بیان کریں گے:



ح ۱:- دوآبہ گنگا جمنا کا علاقہ

سلطان محمود غزنوی نے جب ۱۰۲۷ء میں پنجاب فتح کیا اور لاہور کو فوجی چھاؤنی بنایا تو اس وقت پاک و ہند میں اپ بھرنش کا سکہ چل رہا تھا۔ ابو ریحان البیرونی (۹۷۲ء-۱۰۴۸ء) کا بیان ہے کہ اس وقت "ہندوستان کی زبان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بول چال کی زبان ہے، جس میں عوام بات چیت کرتے ہیں۔ یہ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ دوسری علمی زبان ہے۔ اس کے صرفی و نحوی قاعدے ہیں"۔ اس علمی زبان کا ذکر امیر خسرو نے بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا بول چال کی زبان اپ بھرنش تھی جس کے لفظی معنی پست، افتادہ اور گری پڑی کے ہیں۔ یہ علمی زبان سنسکرت کے مقابلہ میں پست سمجھی جاتی تھی۔ ہیم چندر (۱۰۸۸ء - ۱۱۷۲ء) نے اپ بھرنش کے دوہے۔ مثلاً اپنی پراکرت گرامر میں نقل کیے ہیں۔ ان کی زبان کی موجودہ اردو سے مماثلتیں یہ بتاتی ہیں کہ بارھویں صدی عیسوی میں اردو کے خط و خال ابھرنے شروع ہو گئے تھے۔

ہیم چندر نے جو دوہے نقل کئے ہیں ان میں بھلاّ، ہُوآ، مارآ، بہن، بھگّا، گھرا جی، آدمی، موہوا، تجھو، مجھو وغیرہ کلمے اور صیغے خاص طور پر غور کے قابل ہیں۔ یہ اردو کے موجودہ کلموں اور صیغوں کی قدیم شکلیں ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کہتا ہے کہ "اردو کے چار ارتقائی دور ہیں۔ پہلا قدیم دور ۶۰۰ ق م پر ختم ہوا دوسرا ۵۰۰ء پر اور تیسرا ۱۰۰۰ء پر چوتھے دور کا آغاز میرے خیال میں ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ اور ۱۸۰۰ء پر اختتام کو پہنچا۔ درمیان کے دو سو سال ۱۰۰۰ء تا ۱۲۰۰ء اردو کے لئے عبوری یا تعمیری زمانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں اردو بقول ڈاکٹر چیٹرجی سیال حالت میں تھی۔ خط و خال ابھر چکے تھے لیکن اس میں ابھی استواری اور پختگی نہیں آئی تھی"۔

اردو کے بنیادی سرمایہ کے الفاظ ان چار ارتقائی دوروں میں کس طرح ادل بدل کر موجودہ شکل تک پہنچے ہیں اس کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ لفظ "کیا" کرنا سے ماضی مطلق کا صیغہ واحد غائب ہے۔ قدیم دور میں یہ "کرتہ" (کیا ہوا) تھا۔ دوسرے دور میں یہ "کِتَ" ہوا (اور اس طرح "ر" گرگئی) تیسرے دور میں "کِ" ت حذف کرکے، ہوا اور

عرصہ تک اس کی یہ شکل رہی۔ ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ جب اردو نکھر کر سامنے آئی تو اردو کے عام مزاج کے مطابق اس نے "گیا" کی شکل اختیار کی۔

ضروری نہیں کہ زبان کے سارے سرمایہ کو چار دوروں سے گزرنا پڑا ہو۔ بعض کلمے صرف صرف تین دوروں سے گذرے ہیں۔ مثلاً "بھلا" اور "بہن" کی حسب ذیل تین منزلیں ہیں:

بھدر، بھلا، بھلا

بھگن، بہِن، بہن۔

عبوری دور کی اردو کو گریرسن وغیرہ علما قدیم مغربی ہندی کہتے ہیں۔ مگر شوکت سبزواری کہتا ہے کہ "مغربی ہندی کسی خاص جانی پہچانی زبان کا نام نہیں اور نہ یہ کسی خاص علاقہ میں بولی جانے والی زبان تھی۔ اردو، برج، ہریانی، قنوجی اور بندیلی کا مشترک لسانی سرمایہ مغربی ہندی ہے۔ یہ ایک طرح کی فرضی زبان ہے۔ چند بردائی کی مشہور نظم" پرتھوی راج راسا" کی زبان کو قدیم مغربی ہندی بتایا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ پرتھوی راج راسا کی زبان مصنوعی اور خود ساختہ ادبی زبان ہے، جس میں پنجابی، راجستھانی، برج اور مغربی اپ بھرنش گڈمڈ ہو کر آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہیں۔ برج کے الفاظ اس میں دوسری ہم عصر زبانوں کا مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اس میں اردو عناصر بھی دستیاب ہوتے ہیں لیکن بہت ہی کم۔ اس مصرع میں اردو زبان کا کلمہ "میں" ملتا ہے۔

ایک ماس میں نگر بساؤ (ایک ماہ میں شہر بسایا)

واحد متکلم کی ضمیر "مَیں" اردو ہے۔ "ہوں" برج اور پنجابی ہے۔ پرتھوی راج راسا میں "ہوں" بھی ہے اور "میں" بھی، جیسے۔

مَیں سنیا ساہی بن اندھا کیں (میں نے سنا شاہ نے اندھا کر دیا ہے)

تج بھوگ جوگ مَیں تپ لیں (کھانا پینا چھوڑ میں نے تپسیا اختیار کی)

بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں اردو دہلی اسکے نواحی علاقہ یعنی میرٹھ میں بولی جا رہی تھی۔ محمد غوری کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ اس سے پہلے اردو ابھر کر برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ

بولیوں سے امتیاز حاصل کر کے پختہ اور آزاد بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس امتیاز کے بعد اردو کو اہلِ علم نے "کھڑی بولی" کے نام سے یاد کیا اور اس کی ہم عصر بولیاں "پڑی" کہلائیں۔

شیام سندر داس چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانے کو کھڑی بولی یعنی اردو کے ابھار کا زمانہ بتاتا ہے اور کہتا ہے۔

"۱۳۵۰ء اور ۱۴۵۰ء کے درمیان قدیم ہندی بولیوں نے دھیرے دھیرے برج، اودھی اور کھڑی بولی کا روپ دھارا"۔

مگر ڈاکٹر شوکت سبزواری کو اس رائے سے اتفاق نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اردو کے ابھار کا زمانہ بارھویں صدی عیسوی ہے، اور اگرچہ اس (بارھویں) صدی کی اردو یعنی کھڑی بولی کے نمونے مسلسل اور مرتب صورت میں دستیاب نہیں ہوتے۔ مگر اس عہد کے بعد کی اردو کو دیکھتے ہوئے یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا ابھار بارھویں صدی عیسوی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔

تیرھویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک کی دہلی اور میرٹھ کی اردو کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن یہ خال خال اور بہت ہی کم ہیں۔ بابا فرید گنج شکرؒ (۱۱۷۳ء-۱۲۶۶ء) کا ذیل کا نمونۂ کلام مولانا محمود شیرانی نے کسی قدیم بیاض سے نقل کیا ہے:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با دمِ خود ہمدم و ہشیار باش	صحبتِ اغیار بری بات ہے
باتنِ تنہا چہ روی زیں زمیں	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پندِ شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

ان شعروں کے خط کشیدہ الفاظ اردو زبان کے ہیں۔

اس کے علاوہ بابا فرید گنج شکر رح کے چند کٹے پھٹے مقولے بھی کتب تواریخ میں نقل ہوئے ہیں۔ ان سے بھی اس زمانے کی کھڑی بولی (اردو) کے خط و خال اجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً سید محمد بن

مبارک کرمانی نے سیر الاولیاء میں بابا فرید شکر گنج رح کا ایک مقولہ نقل کیا ہے:

"مادر مومنا! پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

اس میں "کا" "چاند" "بالا" اور "ہوتا ہے" ٹھیٹ اُردُو ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں امیر خسرو (۱۲۵۳ء-۱۳۲۵ء) اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ء - ۱۴۲۲ء) کے تحریری نمونے سامنے آتے ہیں۔ امیر خسرو کے حسب ذیل دو شعر عام تذکرہ نویسوں نے نقل کیے ہیں:

زر گر پسرے چو ماہ پارہ ۔۔۔ کچھ گھڑیے سنواریے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست ۔۔۔ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

ان دونوں شعروں کا دوسرا دوسرا مصرع ٹھیٹ اردو کا ہے۔

ذیل کے اشعار بھی امیر خسرو کی طرف منسوب ہیں:

ز حالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چو زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتہ

سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کوں ہماری بتیاں

چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت من کو درائے لاکھوں جو جان پاون پیا کی گھتیاں

یہ شعر کھڑی بولی یعنی اردو میں ہیں۔ گو آٹے میں نمک کی طرح اس میں برج کی آمیزش بھی ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر چڑجی نے لکھا ہے کہ اردو اس قدیم زمانے (چودھویں صدی عیسوی) میں

آزاد بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ مشہور مراکشی سیاح ابن بطوطہ (۱۳۷۸ء۔ ۱۳۰۴ء) کے سفر نامہ اور مغل شہنشاہ بابر (۱۵۳۰ء۔ ۱۴۸۳ء) کی خود نوشت سوانح میں بھی اردو الفاظ خاصی بڑی تعداد میں استعمال ہوئے ہیں۔ بابر کے مجموعۂ کلام میں اس کا ایک شعر درج ہے جس کا پہلا مصرع پورا اور دوسرے مصرعے کا تین چوتھائی اردو میں ہے۔

مجکانہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا حالنا بس بلگسدر پانی و روٹی

چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں محمد تغلق دہلی سے ہجرت کر کے دکن چلا گیا اور اس طرح اردو زبان بھی اس کے ساتھ جا بسی اور وہاں کی اردو سے الگ تھلگ اسے ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ ڈاکٹر بیلی کا خیال ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے نصف تک دہلوی اور دکنی اردو میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ دونوں مقامات پر وہی ایک زبان بولی جاتی تھی۔ مگر بہمنی حکومت کے قیام (۱۳۴۷ء) کے بعد گجراتی، مرہٹی، تلگو وغیرہ زبانوں کے زیر اثر دکن میں اردو میں تبدیلیاں شروع ہوئیں اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے اس میں اور دہلوی اردو میں اختلافات کی خاصی وسیع و عریض خلیج حائل ہو گئی۔ دہلوی اردو کے دستاویزی نمونوں کی کمیابی کی تلافی دکنی اردو کے نمونوں سے ہو جاتی ہے۔ دکنی اردو کے (منظوم اور منثور) نمونے ۱۳۵۰ء سے ۱۷۰۰ء تک مسلسل اور مرتب انداز میں ملتے ہیں۔ یہ قدیم اردو کے خط و خال کے تعین اور زبان کے ارتقائی دوروں کے سمجھنے میں ہماری امداد کرتے ہیں۔ دکنی اردو کی قدیم ترین تصنیف معراج العاشقین ہے، جسے موجودہ تحقیق کے مطابق خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح نے چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں تصنیف کیا تھا۔ خواجہ بندہ نواز رح ۱۳۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں دکن سے دہلی چلے گئے اور ۱۳۹۸ء تک دہلی میں قیام کر کے پھر دکن چلے گئے۔ اگر معراج العاشقین درحقیقت خواجہ بندہ نواز رح کی تصنیف ہے تو اس کی زبان دہلی کی قدیم زبان ہونی چاہئیے۔

معراج العاشقین کے لسانی مطالعہ کے بعد یہ حیرت انگیز حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسکی زبان مرہٹی، گجراتی، تلگو وغیرہ زبانوں کے اثرات سے بڑی حد تک پاک ہے۔ اس کے

مقابلہ میں شاہ میران جی شمس العشاق (متوفی ۱۴۹۶ء) اور ان کے صاحبزادے برہان الدین جانم[1] (متوفی ۱۵۸۲ء) کی تحریروں میں مرہٹی، گجراتی، پنجابی، برج زبانوں کے اثرات ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ جب معراج العاشقین تصنیف ہوئی تو دکنی اردو دہلوی اردو سے مختلف نہ تھی، اور اپنی اصل سے بچھڑے اسے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ بیلی رام اور شری رام شرما نے لکھا ہے، کہ اس کے مصنف خواجہ بندہ نواز رحمۃ نے اپنی عمر کے ۶۵ سال دہلی میں گذارے تھے، اس لئے انہوں نے دہلی کی اسی زبان میں لکھا جو اس زمانہ میں دہلی کے کوچہ و بازار میں بولی جاتی تھی۔

بہرحال یہ امر شبہ سے بالاتر ہے کہ قدیم دکنی اردو کا قدیم روپ ہے۔ قدیم اُردُو کے جلوے دکن کی تصانیف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن کا سلسلہ تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور جن کے مخطوطے آئے دن تاریکی سے روشنی میں آ رہے ہیں۔

" اردو[2] ہند آریائی خاندان کی زبان ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب چار واسطوں سے قدیم ہند آریائی تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کی دوسری جدید زبانوں یعنی پنجابی، سندھی، راجستھانی، گجراتی، مرہٹی کی طرح بنیادی الفاظ، مادے، سابقے، لاحقے اردو کو اپنی اصل ہند آریائی سے ترکے میں ملے۔ اردو کا تمام تر بنیادی سرمایہ ہند آریائی ہے، وضع الفاظ اور اخذ و اشتقاق کے قاعدے ہند آریائی ہیں، جنس اور گردانیں ہند آریائی ہیں، اسما کی تعریف اور ان کے اعرابی لاحقے ہند آریائی ہیں، اس خصوصیت میں اردو اپنی ہم عصر بولیوں کی برابر کی شریک ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں بھی وہ ان کی شریک ہے کہ اس کا نحوی تانا بانا یعنی الفاظ کی ترتیب غیر آریائی ہے جو نتیجہ ہے دراوڑ اور کول زبانوں سے تاثر کا۔ اردو کا صرفی حصہ آریائی ہے اور نحوی حصہ دراوڑ یا منڈا[3]۔"

---

[1]: یہ دونوں بزرگ دکنی تھے اور ان کی زبان دکنی اردو۔ [2]: اردو لسانیات از ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ [3]: منڈا قبائل سرزمین پاک و ہند کے قدیم ترین باشندے کہے جاتے ہیں۔ (اردو زبان کی قدیم تاریخ از عین الحق فریدکوٹی، ص ۹۶)

اُردو سندھی کے لسانی روابط

از شرف الدین اصلاحی

زبان اور انسان

زبان انسان کا خاصہ ہے۔ یہ انسان کے ساتھ ہی وجود میں آئی، انسان کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پھیلتی گئی، اور انسان ہی کی طرح گروہوں اور خاندانوں میں بٹتی رہی۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک نر اور مادہ سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو[۱]۔

جس طرح انسان باعتبار نسل ایک آدم کی اولاد ہونے کے باوجود خاندانوں اور قبیلوں میں بٹا ہوا ہے، اور مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں بٹا ہونے کے باوجود اصلاً ایک ہے، اسی طرح زبانیں گوناگوں اور مختلف النوع ہونے کے باوجود کسی ایک ہی اُم الالسنہ (مادر زبان) کی ذریت (اولاد) ہیں، اور ان کے آپس میں رشتے ناطے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زبانوں کے تنوع اور اختلاف کو اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے:

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ بے شک اس میں جہانیوں کے لئے نشانیاں ہیں[۲]۔

گہری نظر سے دیکھا جائے تو زبان کی تاریخ خود انسان کی تاریخ ہے۔ علم اللسان[۳] اور علم الانسان[۴] میں گہرا تعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ جب اور جہاں زبان کی تاریخ پر بحث آتی ہے وہاں نسلِ انسانی کا ذکر پہلے آتا ہے۔ علمائے لسانیات نے دنیا کی زبانوں کے ساتھ مختلف انسانی گروہوں اور خاندانوں کا جائزہ بھی لینے کی کوشش کی ہے، بلکہ ضمناً ان کے سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی حالات سے بھی بحث کی ہے، اس لئے کہ یہ زبانوں کی ساخت پرداخت اور ان کی نشوونما اور ارتقا پر اثر انداز ہونے والے اسباب و عوامل میں سے ہیں اور ان کے مطالعے کے بغیر زبانوں کا تحقیقی مطالعہ نامکمل رہتا ہے (جیسا کہ سب زبانوں میں ہوتا ہے)

ح۱: قرآن۔ سورۂ حجرات۔ آیت ۱۳، ح۲ قرآن۔ سورۂ روم۔ آیت ۲۲۔ ح۳ زبانوں کا علم ح۴ انسانوں کے بارے میں علم۔

اور کیونکہ اردو کی جائے پیدائش سرزمین پاک وہند ہے، اس لئے اس کے لسانی پس منظر کو سمجھنے کے لئے سرزمینِ پاک وہند میں مختلف اقوام کے ورود کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔

پاک وہند کے قدیم ترین باشندے

منڈا قبائل "عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ "منڈا قبائل" برصغیر پاک وہند کے قدیم ترین باشندے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ماہرین منڈا قبائل کو قدیم آسٹرلوی نسل سے منسلک قرار دیتے ہیں جو کہ ایک وقت میں نیوزی لینڈ سے لے کر پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ برصغیر پاک وہند کا منڈا گروہ بھیل سنتھال، منڈا، ساورا، ہو، کوروا، جانگ اور کورکو وغیرہ قبائل پر مشتمل ہے۔"

نگریٹو سرزمین پاک وہند پر سب سے پہلے آنے والے، جن کے آثار اب بھی دستیاب ہیں، حبشی نسل کے وہ لوگ تھے جو غالباً افریقہ سے سمندر کے کنارے کنارے چل کر سرزمین پاک وہند پر پہنچے۔ انہیں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے نگریٹو (NEGRITO) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان لوگوں کو زراعت یا گلہ بانی کا علم نہیں تھا بلکہ یہ ابتدائی حجری (پتھر کی) تہذیب کے علمبردار تھے۔

آسٹرک دوسری قوم کے لوگ جن کے سرزمین پاک وہند میں آنے کا سراغ ملتا ہے، بحیرۂ روم کی طرف سے آئے۔ انھیں پروٹو آسٹرالائڈ (PROTO AUSTRALIOD) یا آسٹرک (AUSTRIC) کہا جاتا ہے۔ آسٹرک قبیلے شمالی اور وسطی ہندوستان میں آباد ہوگئے اور غالباً آریوں کے آنے سے قبل وہ دراوڑوں کے ساتھ مل کر ترقی کرتے رہے۔ آسٹرک قبائل کے ہندوستان میں آنے کا صحیح زمانہ نہیں بتایا جا سکتا، لیکن اسے پانچ ہزار قبل مسیح سے پیچھے بھی نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ دراوڑ نسل کے لوگ ان کے بعد ہندوستان میں داخل ہوئے اور ان کے آنے کا زمانہ بھی تقریباً یہی یعنی پانچ ہزار قبل مسیح ہے۔

قدیم ترین پاک وہند کے ان دو انسانی گروہوں کے صرف نام معلوم ہیں، وہ کیا زبانیں بولتے تھے اور ان کی زبانوں نے ہمارے موجودہ یا قدیم ہند آریائی زبانوں پر کوئی اثر ڈالا یا نہیں؟

ؔ:۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ از عین الحق فرید کوٹی۔

تاریخ خاموش ہے۔

دراوڑ

ہندوستان میں آنے والا تیسرا بڑا گروہ وہ ہے جیسے دراوڑ کہا جاتا ہے۔ اس نسل کے لوگ بھی بحیرہ روم ہی کی طرف سے آئے اور ابتداً وادیٔ سندھ میں بسے، پھر آہستہ آہستہ ملک کے دوسرے اور خاص کر شمالی حصوں میں پھیل گئے یہ بات یقین کی حد تک تسلیم کر لی گئی ہے کہ آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی یہاں ایک تہذیب کا نشو و نما ہوا تھا، جو ایک ترقی یافتہ زبان کے بغیر ناممکن تھا۔

آریوں سے پہلے کی یہی (دراوڑ) ایک نسل ہے جس کا نہ صرف لسانی ورثہ ایک خاندانِ السنہ کی حیثیت سے ہندوستان میں موجود ہے، بلکہ ہند و آریائی زبانوں پر جس کی زبانوں کے اثرات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ جنوبی ہند میں اس خاندان کی چار بڑی زبانیں رائج ہیں۔ جو السنۂ عالم کی برادری میں اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔ یہ زبانیں تامل، تلگو، کنڑی اور ملیالم ہیں۔ مغربی پاکستان کے علاقہ بلوچستان میں بھی اس خاندان کی ایک زبان براہوی پائی جاتی ہے۔ بعض علماء نے موئن جو دڑو کی زبان کا رشتہ بھی دراوڑ خاندان سے ملانے کی کوشش کی ہے جو ہنوز تحقیق طلب ہے۔ جب تک موئن جو دڑو کی کھدائی میں نکلی ہوئی تحریریں ماہرینِ لسانیات سے ٹھیک ٹھیک پڑھ نہ لی جائیں اور ان کی زبانوں کی ہیئت متعین نہ ہو جائے، اس وقت تک اس دعوے کی صداقت مشکوک ہے۔

آریہ قبائل کی آمد سے پہلے دراوڑ نسل کے لوگ پورے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ عقل و فکر کی رو سے یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ آریوں نے آ کر ان کا یک قلم صفایا کر دیا ہو گا۔ ان (دراوڑوں) کو غلام بنا کر رکھنے کا ذکر قدیم کتابوں سے ملتا ہے۔ دراوڑ نسل کے ساتھ آریوں نے جو بھی سلوک کیا ہو، وہ اپنی زبان کو ان کی زبانوں کے اثرات سے نہیں بچا سکے تھے۔ ماہرینِ لسانیات نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہند آریائی زبانیں، بلکہ سنسکرت بھی کم و بیش دراوڑی زبانوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ کم از کم الفاظ کا لین دین تو یقیناً ہوا۔ اس لین دین کے نشانات آج بھی ہمیں سنسکرت کی جانشین زبانوں میں ملتے ہیں۔ کٹیا (جھونپڑی)، کوٹ (قلعہ) نیر (پانی) وغیرہ دراوڑی اصل کے الفاظ ہیں۔ جو آج بھی اردو،

سندھی اور دیگر ہند آریائی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔
آریائی اور دراوڑی زبانوں کے خاندانوں کا تقابلی مقابلہ ابھی ٹھیک طور سے نہیں کیا گیا۔ بہت سے وہ الفاظ جنھیں ہم آریائی سمجھتے ہیں، ممکن ہے وہ خود آریائی زبانوں نے دراوڑی خاندان کی زبانوں سے مستعار لئے ہوں۔ بہر حال ہم یہاں پر اتنا ہی کہیں گے کہ اردو سرمایۂ الفاظ کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو دراوڑی اثرات کا نتیجہ ہے، اگر چہ موجودہ حالات میں ان کی نشان دہی مشکل ہے۔
مولانا سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں لکھا ہے:
"ہندوستان کے اصلی رہنے والے دراویڈی اور ہندوستان کی اصل زبانیں تامل، تلگو اور کنٹری وغیرہ دراویڈی زبانیں ہیں۔ سنسکرت اور پرانی ہندی خود باہر کی زبانیں ہیں جن کا اس ملک سے چند ہزار برس سے زیادہ تعلق نہیں . . . آریہ جو زبان بولتے ہوئے اس ملک میں آئے، معلوم نہیں وہ اس کو کب تک بولتے رہے۔ بہر حال اس میں میل ہوا اور اس سے اتر کر ایک دوسری زبان کا خاکہ تیار ہوا، جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبہ میں الگ الگ ہو گئی۔"
سید سلیمان ندوی کے مذکورہ بالا بیان سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ "سنسکرت اور پرانی ہندی باہر کی زبانیں ہیں"۔ تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ وہ زبانیں ہیں جو آریہ بولتے ہوئے ہندوستان میں آئے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں داخل ہوتے وقت جو زبان آریہ بولتے تھے اس کا کوئی نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ لہٰذا سنسکرت آریوں کی اس زبان کا نام ہے جو انہوں نے ہندوستان میں جم جانے کے ایک عرصہ بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں سے معیاری اور ادبی الفاظ سے بنائی تھی اور اسے زیادہ سے زیادہ اپنی قدیم زبان کے قریب کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اس ساری کوشش کے باوجود روزانہ کی ضروریات کے تحت یہاں کی زبانوں کے بہت سے الفاظ اس زبان یعنی سنسکرت میں شامل ہونے ناگزیر تھے اور پرانی ہندی تو سنسکرت سے بھی بعد معرض وجود میں آئی۔ ایسی حالت میں اس میں بھی یہاں کی زبانوں کی آمیزش ہے۔

آریوں کی آمد دراوڑ نسل کے بعد سرزمین پاک و ہند کی وارث آریہ قوم ہوئی جو دو ہزار اور ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں یہاں آئی۔

پنچ جن ہندوؤں کی مذہبی کتاب "رگ وید" سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریہ لوگ جدا جدا قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے، جن میں پانچ خاندان نمایاں تھے، اس "پنچ جن" (Five Folks) کا لفظ "رگ وید" میں کثرت سے آتا ہے۔

"رگ وید" میں آریہ نسل کے سبھی خاندانوں کے متعلق مذکور ہے کہ وہ پانی کی سہولت کی وجہ سے سات ندیوں کے کنارے آباد ہو گئے، جن میں سے پانچ ندیاں پنجاب کی تھیں، چھٹی سرسوتی اور ساتویں سندھ۔ ان ساتوں کو ملا کر "سپت سندھو" یعنی سات دریا کہتے تھے۔

مسلمانوں کی آمد آریہ کے بعد چند دیگر اقوام بھی ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں، مگر یہ یہاں کوئی دیرپا اثر نہ چھوڑ سکیں۔

اس کے بعد باہر سے آنے والے جس انسانی گروہ کو نسلی اور لسانی اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے وہ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ ہماری لسانی تاریخ کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔

ہندوستان میں آریہ لوگوں کی زبانیں ڈھائی تین ہزار سال تک ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی تھیں کہ مسلمان یہاں آئے۔ آریوں کی ان زبانوں کے تین دور اہم اور نمایاں ہیں:

(ا) سنسکرت اور اس کی ہم عصر بولیوں کا دور (۱۵۰۰ قبل مسیح سے ۵۰۰ قبل مسیح تک)

(ب) پراکرتوں کا دور (۵۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ عیسوی تک)

(ج) اپ بھرنشوں کا دور (۶۰۰ عیسوی سے ۱۰۰۰ عیسوی تک)

جدید ہند آریائی زبانیں ۱۰۰۰ عیسوی کے بعد اپ بھرنشوں نے چولا بدلا اور جدید ہند آریائی زبانیں معرض وجود میں آئیں۔

ماہرین لسانیات نے متفقہ طور پر یہ بات تسلیم کی ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کے ابھرنے کا زمانہ کم و بیش یہی ہے۔

جدید ہند آریائی زبانیں اور مسلمان جدید ہند آریائی زبانوں کا ظہور حقیقتاً ہندوستان

میں مسلمانوں کی آمد کا رہینِ منت ہے۔ زبانیں یوں تو اپنے فطری ارتقا کا سفر جاری رکھتی ہیں اور مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تو بھی ان میں تغیر لازماً ہوتا۔ لیکن اس صورت میں ان کا وہ روپ ہرگز نہ ہوتا جو آج ہے اس میں شک نہیں کہ زبانیں اصلاً وہی رہیں اور ان کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی خاص فرق نہیں آیا، لیکن خط و خال میں نمایاں تبدیلی جو کہ ہندوستان کی لسانی تاریخ میں ایک نئے عہد، ایک جدید دور کی نقیب ثابت ہوئی۔ اور بے شک یہ عہد آفریں تبدیلی مسلمانوں ہی کی لائی ہوئی تھی۔

یوں تو ہندوستان کی سبھی زبانوں (آریائی اور غیر آریائی) نے اسلامی اثرات قبول کیے، لیکن اردو تو بالخصوص تمام تر اسلامی فتوحات کی پیداوار اور عربی، فارسی کے الفاظ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو مسلمانوں کے جلو میں باہر سے آئی یا آسمان سے اتری کہنے کا منشا محض اس قدر ہے کہ جن اسباب نے دوآبہ گنگ جمن کی ایک بولی کو اس حد تک بدل ڈالا کہ وہ نئے روپ کے ساتھ نئے نام سے بھی روشناس ہوئی، مادہ مسلمانوں کے لائے ہوئے تھے۔

آریوں نے ہندوستان کو زبانوں کے ایک نئے خاندان سے روشناس کیا اور مسلمانوں نے ان زبانوں کے حسب نسب کو تو باقی رہنے دیا لیکن ان کے تہذیبی اور ثقافتی سرمائے کو یکسر بدل ڈالا اور انھیں ایسے لسانی خزانوں سے مالا مال کر دیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اردو اس زبان کا عرفی نام ہے جو ذات میں ہند آریائی تو صفات میں ہند اسلامی زبان ہے، جو اپنے منبع و مخرج کے اعتبار سے شروع شروع میں ایک محدود علاقہ کی زبان تھی، مگر بعد میں پھیلتے پھیلتے اس نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر بیرون ہند تک جا پہنچی۔

اردو کا ماخذ

اردو کی پیدائش اور جائے پیدائش کے متعلق مختلف قسم کی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ کسی نے اس کا ہیولیٰ سندھ میں تیار کیا تو کسی نے

پنجاب سے اس کا خمیر اٹھایا۔ کسی نے دکن کو اس کی جائے پیدائش قرار دیا تو کسی نے گجرات کو اس کی جنم بھومی بتایا۔ کسی نے برج بھاشا سے اسے نکالا تو کسی نے اکبر اور شاہجہاں کے دربار اور لشکر گاہ میں اس کی اصل کا کھوج لگایا۔ اردو کی اصل اور جائے پیدائش کا پتہ لگانے کے لئے درج ذیل بحث ضروری ہے۔

اردو اور قدیم ہند آریائی

اردو اصلاً ہند آریائی زبان ہے۔ آریہ قبائل ہندوستان میں مختلف گروہوں میں آئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ان مختلف گروہوں کی زبانیں اسی وقت سے اشتراک و اختلاف کا امتزاج تھیں۔ بعد میں جغرافیائی اور علاقائی اثرات نے ان اختلافات کو اور بڑھایا، یہاں تک کہ ہر علاقہ کی زبان بالکل الگ ہو گئی۔ اسے ماہرین نے ابتدائی یا قدیم پراکرتوں کا دور کہا ہے، جس کا زمانہ تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ قبل مسیح تک ہے۔ یہ پراکرتیں بول چال کی زبانیں تھیں اور ان کے الگ الگ نام نہ تھے بلکہ یہ ان صوبوں کی طرف منسوب کی جاتی تھیں جن میں وہ بولی جاتی تھیں۔ اسی دور کی ادبی زبان نے سنسکرت کا نام پایا۔

اپ بھرنشائیں

پراکرتیں لسانی تغیرات سے گزرتی ہوئی نئی شکلوں میں سامنے آئیں اور انھیں اپ بھرنشائیں کہنے لگے تو پراکرت کے بعد اپ بھرنش کا دور آیا۔ ہماری جدید زبانوں (جن میں اردو شامل ہے) کا براہ راست جن سے تعلق ہے وہ اپ بھرنشائیں ہیں نہ کہ سنسکرت یا پراکرتیں۔ پراکرتوں کی طرح اپ بھرنشائیں بھی ہر علاقہ کی جدا جدا تھیں۔ اپ بھرنشوں میں سے صرف ناگر اپ بھرنش کے تحریری نمونے ملے ہیں۔

شورسینی اپ بھرنش

مذکورہ بالا ناگر اپ بھرنش کی ایک شاخ شورسینی اپ بھرنش ہے[ط۱] جو مغربی ہندی کے واسطے سے اردو کی اصل ہے اور جس کا علاقہ دوآبہ گنگا جمنا ہے۔

ط۱: متھرا اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ قدیم زمانہ میں شورسین کے نام سے موسوم تھا۔ اسی نسبت سے اس علاقہ کی اپ بھرنش شورسینی کہلائی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ شورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی اور مغربی ہندی سے اردو نکلی۔

مغربی ہندی جیساکہ گریرسن نے ذکر کیا ہے شورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی نکلی۔ مغربی ہندی کا علاقہ گریرسن کے خیال میں وہی ہے جس کا ذکر ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں مدھیہ دیش[1] کے نام سے ملتا ہے اور جو ہندوستان میں خالص آریائی تہذیب کا خاص مرکز شمار ہوتا تھا۔

مغربی ہندی کی بولیاں گریرسن نے مغربی ہندی کو درج ذیل پانچ بولیوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ ہندوستانی

۲۔ بانگڑو

۳۔ برج بھاشا

۴۔ قنوجی

۵۔ بندیلی

گریرسن کے نزدیک مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سب سے اہم بولی ہندوستانی ہے، جس کا ایک روپ اردو کے نام سے منسوب ہے۔ اردو آہستہ آہستہ سارے ہندوستان میں اور پھر بیرون ہند تک پھیل گئی۔

اردو اور ہندی غلام محی الدین زورؔ لکھتے ہیں :

"ہندی اردو کی جدید ترین شاخ کا نام ہے، جو فورٹ ولیم کالج کے قیام (انیسویں صدی عیسوی کے آغاز) کے بعد سے ناگری رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور جس پر عربی فارسی کی جگہ برج بھاشا کا اثر زیادہ ہے۔"

گریرسن بھی ہندی کو اردو کے بعد کی پیداوار بتاتا ہے[2]

ہندی (جدید ہندی) کو اردو کی شاخ کہنا جانب داری اور ناانصافی کی بات ہے حقیقت

---

[1]: مدھیہ دیش ملک کا درمیانی حصہ یا درمیانی ملک۔ یہاں مراد ہے دوآبہ گنگا جمنا۔

[2]: لسانی جائزہ، جلد نہم، حصہ اول، ص ۱

یہ ہے کہ ہندی (جدید ہندی) اور اردو دونوں قدیم ہندی یا ہندوستانی کی شاخیں ہیں۔ البتہ اردو عمر اور دائرہ اثر میں بڑی ہے اور ہندی (جدید ہندی) چھوٹی۔ ہندی (جدید ہندی) ہندوؤں کی لنگوا فرینکا ہے تو اردو مسلمانوں کی لنگوا فرینکا۔

اردو اور کھڑی

پروفیسر مسعود حسین خاں کھڑی اور اردو میں ماں بیٹی کا رشتہ بتلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کھڑی وہی زبان ہے جسے گریرسن ہندوستان کا نام دیتا ہے۔

ڈاکٹر زور کا کہنا کہ کھڑی اردو کی ماں نہیں بلکہ بہن ہے۔

کھڑی یا کھری

گارساں دتیاسی کے مطابق یہ لفظ کھڑی نہیں بلکہ کھری ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"کھری یا ٹھیٹ، ہندوستانی کی ایک شکل ہے، جو دہلی اور آگرہ کی زبان ہے اور جو عربی، فارسی الفاظ سے پاک ہوتی ہے"۔

للولال جی "پریم ساگر" میں لکھتا ہے :

"دلی اور آگرہ کی کھری بولی میں"

اس سلسلہ میں مزید تحقیق جاری ہے۔

کیا اردو ایک مخلوط زبان ہے؟

اردو کی پیدائش یا ارتقا کے ذکر میں یہ بات بالعموم کہی جاتی ہے کہ وہ تہذیبوں کے اختلاط اور دو قوموں کے میل جول کا نتیجہ ہے، یعنی یہ کہ مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے اور ان کا ربط ضبط یہاں کے مقامی لوگوں سے ہوا تو فاتح اور مفتوح کی زبانوں نے مل کر ایک نئی زبان کا روپ دھارا اور اس طرح اردو وجود میں آئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو اپنے انفرادی وجود اور امتیازی خط و خال کے لئے سرتا سر عربی فارسی عناصر اور اسلامی اثرات کی رہین منت ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں۔ اردو کا تعلق اس زبان سے ہے جو آریہ قبائل اپنے ساتھ لائے۔ اسی اصل سے ہزاروں سال کے ارتقا کے بعد اردو معرضِ وجود میں آئی۔

اردو کے مخلوط ہونے کا خیال صرف اس حد تک درست ہے کہ اس نے مختلف زبانوں سے اپنے الفاظ کا خزانہ بھرا ہے، ورنہ جہاں تک اس کے بنیادی ڈھانچہ کا تعلق ہے دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح وہ بھی باقاعدہ اپنا شجرہ نسب رکھتی ہے اور قدیم ہند آریائی کے ساتھ اس کا بھی وہی تعلق ہے جو اس کی ہم عصر بولیوں کا ہے۔ اردو کا مخلوط ہونے کا ہی تصور تھا جو بعض اہل علم کے اس لسانی مغالطے کا سبب بنا کر اردو کی جائے پیدائش سندھ ہے۔

کیا اردو کا مولد سندھ ہے؟

یہ نظریہ سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے "نقوشِ سلیمانی" میں پیش کیا مگر ان کا یہ خیال خود ان کے اپنے مضمون سے غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان تھا "اردو کیونکر پیدا ہوئی؟" اور یہ مضمون رسالہ معارف، جولائی ۱۹۳۳ء میں چھپا تھا۔

بہر کیف یہ نظریہ کہ اردو کا مولد سرزمین سندھ میں ہے، اگرچہ علم و تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترے، لیکن اتنی بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن عوامل نے ہندوستان کی ایک آریائی زبان کو اردو کا قالب عطا کیا، وہ سب سے پہلے سندھ میں کارفرما ہوئے۔ اور اس کا نتیجہ موجودہ سندھی ہے۔ سندھی اور اردو کے اشتراک اور مشابہت کا ایک پہلو ایسا ہے جو صرف انہیں عوامل کا مرہونِ منت ہے، ہماری مراد عربی فارسی اثرات سے ہے جو انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد قبول کئے۔

اردو کے مختلف نام

اردو مختلف وقتوں اور مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی۔ "اردو" کچھ زیادہ پرانا نہیں۔ کوئی دو سو سال سے ہماری یہ زبان اس نام سے موسوم ہے۔ ابتداً لفظ اردو بصورت ترکیب اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوتا تھا اور "زبانِ اردوئے معلیٰ" کہتے تھے، یعنی شاہی لشکر کی زبان رفتہ رفتہ زبان کا لفظ خارج ہو گیا اور "اردوِ معلیٰ" بچ رہا۔ کچھ عرصہ بعد از راہ اختصار "معلیٰ" بھی ساقط ہو گیا اور صرف "اردو" باقی رہ گیا۔

اردو شعرا میں سب سے پہلے مصحفی (۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء) کے ہاں یہ لفظ

بطور اسم علم آیا ہے ؎

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم، اے مصحفی! اردو ہماری ہے

محمد اکرم چغتائی صاحب کا یہ خیال ہے کہ لفظ "اردو" زبان کے معنوں میں سب سے پہلے مائل دہلوی (استاد شاہ نصیر دہلوی) نے استعمال کیا ہے۔ یہ بات انھوں نے رسالہ "نقوش" بابت اکتوبر ۱۹۶۶ء کے مضمون "مائل دہلوی کا ایک اہم تاریخی قطعہ" میں کہی ہے۔

اردو کے چند قدیم نام

ہندی، ہندوی، ہندوستانی، دہلوی، زبانِ ہندوستان، لنگوا ہندوستان کا، ریختہ۔ علاقائی نسبت سے قطع نظر دکنی اور گوجری کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

اردو بحیثیت لنگوا فرینکا

مختلف زبانیں بولنے والوں میں میل جول بڑھتا ہے تو ایک ایسی زبان کی ضرورت پڑتی ہے جو سب کا مشترک ذریعۂ گفتگو ہو۔ جو زبان اس ضرورت کو پورا کرے وہ لنگوا فرینکا کہلاتی ہے کسی ملک کی لنگوا فرینکا وہی زبان بن سکتی ہے جو ایک طرف سادہ اور سہل، جامع اور وسیع ہو۔ تو دوسری طرف اس ملک کی مختلف زبانوں کے ساتھ اس کا لسانی اشتراک بھی ہو۔ کوئی اجنبی اور بے تعلق زبان عوامی سطح پر کبھی لنگوا فرینکا نہیں بن سکتی۔

اردو کے متعلق یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ یہ ایک مخلوط زبان ہے، جو مسلمانوں کے عہد میں یہیں کی ایک دیسی بولی میں دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں کی آمیزش سے پیدا ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صدیوں سے افتراق و تشتت ؎ کا شکار ہندوستان، اسلامی دور میں پہلی بار ایک مضبوط سیاسی مرکز کے ماتحت ایسا اجتماعی نظام کی برکتوں سے بہرہ ور ہوا جس کی بنیاد اخوت، مساوات اور باہمی رواداری پر تھی۔ اس نظام نے ملک کے تمام باشندوں کو بلا امتیاز نسل و مذہب رشتۂ وحدت میں منسلک کر دیا۔ دوریاں گھٹ گئیں، فاصلے کم ہو گئے اور باہمی میل موافقت کو فروغ ہوا تو ایک ایسی زبان

؎: علیحدگی، جدا جدا رہنے کا انداز مل جل کر رہنے کا الٹ۔

کی ضرورت محسوس ہوئی، جو مختلف مادری زبانیں رکھنے والوں میں مشترک ذریعہ افہام وتفہیم ہو۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ ضرورت ہی اردو کی پیدائش کا باعث ہوئی، گویا اردو پیدا ہی لنگوافرینکا کی حیثیت سے ہوئی۔ ابتدا میں وہ محض بول چال کی زبان تھی اور اس کا حلقہ بھی محدود تھا، مگر آہستہ آہستہ ادبی حیثیت اختیار کرتی گئی، اور ساتھ ہی اس کا دائرہ اثر بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ جغرافیائی حدود کو توڑ کر پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور تمام صوبوں کی مشترکہ زبان بن گئی۔

اردو دنیا کی تیسری زبان اقوام متحدہ کے ایک جائزے کے مطابق آج دنیا کی پہلی تین سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں سے ایک اردو ہے۔

ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق ——— (ڈاکٹر مہر عبدالحق)

جارج گریرسن کا کہنا ہے کہ ہند آریائی لوگوں کی زبان کا اولین تحریری نمونہ وہ ہے جو ویدوں میں موجود ہے، اور ویدوں کی تصنیف کا زمانہ ۱۵۰۰ قبل مسیح سے پہلے کا ہے اس زمانہ تک آریا قبائل مختلف اوقات میں ہندوستان میں داخل ہوتے رہے۔

آریا وسط ایشیا سے اٹھ کر آئے تھے اور ہندوستان پہنچنے سے پہلے راہ میں انہیں کئی قوموں اور ملکوں سے دوچار ہونا پڑا، اور ایران میں تو وہ عرصہ دراز تک رہے، اس طرح جو زبان وہ وسط ایشیا سے لے کر چلے تھے راہ میں ساری احتیاطوں کے باوجود اس پر مختلف زبانوں کے اثرات ہوئے اور ان کی زبان آہستہ آہستہ مختلف بولیوں کی شکل اختیار کر گئی۔ لہٰذا آریا قبائل کے جو گروہ وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آتے رہے ان کی بولیوں میں اس طرح فرق ہونا قدرتی امر تھا جس طرح آج ہند آریائی زبان میں اختلاف ہے۔

گریرسن نے جو آریائی لسانی نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آریاؤں کے دو گروہ آئے۔ ایک پہلے اور دوسرا اس کے بعد۔ پہلا گروہ وسط ہند یعنی دوآبہ گنگا جمنا میں مقیم تھا کہ دوسرا گروہ وارد ہوا۔ اس دوسرے گروہ نے پہلے گروہ کو شمال جنوب اور جنوب مغرب کی طرف دھکیل دیا۔ اور خود ان کی جگہ مقیم ہو گیا۔ اس طرح پہلا گروہ دوسرے گروہ کے گرد پھیل گیا۔ اس لحاظ سے نئے آنے والے "اندرونی آریا" بن گئے اور دھکیل دیئے جانے والے "بیرونی آریا" کہلائے۔ اندرونی دائرے والوں کی زبان بیرونی دائرے والوں کی زبان سے الگ تھلگ رہی۔ یہ ویدوں اور برہمنوں کی زبان تھی۔ جو اندرونی دائرے میں پرورش پاتی رہی، گویا زبانوں کے دو گروہ ہو گئے (۱) اندرونی دائرے کی زبانیں (۲) بیرونی دائرے کی زبانیں۔ مگر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور گریرسن کے اس نظریئے سے اتفاق نہیں کرتے۔

ہندوستان میں آریائی زبان ایک تنہا اور معین زبان کی شکل میں داخل نہیں ہوئی۔ بلکہ متعدد بولیوں کی حیثیت سے آئی ہے جو متفرق آریا قبیلے مختلف اوقات

ہیں اپنے ساتھ لائے۔ ان بولیوں میں صرف ایک بولی اپنی ابتدائی اور اصلی حالت میں ملتی ہے اور وہ ویدوں میں محفوظ ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئی ہے۔ تاہم دوسری بولیاں بھی ضائع نہیں ہوئیں بلکہ ان کی تبدیل شدہ صورت ہمیں ہند آریائی بولیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہند آریائی بولیوں میں جو اختلاف ہے یہ اختلاف غالباً آج سے تین ہزار برس پہلے بھی یعنی آریوں کی ہندوستان میں آمد کے وقت بھی موجود ہوگا۔

پراکرتیں

پراکرتوں کی ماہیت:۔ جب آریہ قوم کے لوگ ہندوستان میں آنے شروع ہوئے تو اس وقت یہاں (پاک و ہند میں) مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے جو آریوں سے پہلے ہندوستان میں آ کر بس گئے تھے۔ ان میں افریقہ سے آئے ہوئے نگرائڈ بھی تھے، جن کے نشانات اب جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فلسطین سے پروٹو آسٹرائڈ آئے اور لنکا، برما، ملایا اور آسٹریلیا میں پھیل گئے۔ پھر آسٹرک آئے اور شمالی ہندوستان کے بعض حصوں میں آباد ہو گئے۔ انھوں نے اپنا ایک تمدنی ڈھانچہ کھڑا کر لیا، اور ان میں سے بعض گروہ چین اور انڈونیشیا کی طرف چلے گئے۔ آسٹرک گروہ کے لوگوں کی زبانیں بعض غیر متمدن قبائل میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد یعنی تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح میں دراوڑی نسل کے لوگ ہندوستان میں وارد ہوئے۔ یہ لوگ بھی بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک سے آئے اور ہندوستان پہنچ کر انھوں نے ہڑپا اور موہن جو دارو (پنجاب اور سندھ) میں تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح ایک زبردست تمدن کی بنیاد رکھی۔ یہ لوگ شمالی ہندوستان میں پھیل کر کسی حد تک آسٹرک لوگوں سے مخلوط ہو گئے۔ اور جب آریہ ہندوستان میں آئے تو دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا۔ آج ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے بعد دراوڑی زبانیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کا ادب موجود ہے اور برابر ترقی کر رہا ہے۔ ان کے علاوہ منگول نسل کے لوگ بھی ہندوستان میں آئے۔ ان کی یادگار آسام اور نیپال کی پہاڑی بولیاں ہیں۔

ہندوستان کی قدیم ترین آریائی بول چال کا نمونہ ہمیں رگ وید میں ملتا ہے۔ اس کتاب کے اکثر گیت اسی زبان میں ہیں جو زبان وہ لوگ اس وقت گھروں اور بازاروں میں بولتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں سنسکرت وہ زبان ہے جو عام بول چال سے ہٹ کر تھی اور جو ترقی کر کے کلاسیکی سنسکرت کہلائی۔ اس بناء پر ہم لوگ وید کی زبان کو سب سے پہلی پراکرت (فطری زبان، عوام کی بول چال کی زبان) کہہ سکتے ہیں۔

سنسکرت اور پراکرت کا تعلق:۔ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت ویدک عہد کی وہ پراکرت ہے جو بعد میں علمی، ادبی اور مذہبی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی، اور اس عہد کی دوسری پراکرتیں یہ حیثیت نہ حاصل کر سکیں، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت راجاؤں، عالموں اور پنڈتوں کی تہذیب یافتہ زبان بن گئی اور پراکرتیں عام لوگوں کی فطری بول چال کی بولیاں بنی رہیں۔ قدیم ترین ڈراموں میں یہ فرق نمایاں طور پر ظاہر کیا گیا ہے، برہمن، راجا، وزیر اور امیر سنسکرت بولتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور عورتیں اور عوام پراکرتیں بولتے ہوئے۔ لہٰذا یہ خیال غلط ہے کہ پراکرتیں سنسکرت سے نکلی ہیں یا سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔ بلکہ سنسکرت بھی شروع میں دیگر پراکرتوں کی طرح ایک پراکرت یعنی عوام کے گھروں اور بازاروں میں بولی جانے والی ایک بولی تھی، اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے سنسکرت یعنی صاف وشستہ زبان بن گئی اور دوسری پراکرتیں یہ ترقی نہ کر سکیں۔

ویدوں کی تصنیف کے زمانہ میں عوام کی بولیاں پراکرتیں تھیں، ان پراکرتوں کو "ابتدائی پراکرتیں" کہنا چاہیئے اور ان پراکرتوں کو جو ان ابتدائی پراکرتوں سے نکلیں اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے کرتے موجودہ سنسکرتی ہند آریائی بولیوں کی شکل اختیار کر گئیں "ثانوی پراکرتیں" کہنا چاہیئے اور ان کی آخری ترقی یافتہ شکل کو (جیسی کہ یہ ہمارے سامنے نو سو سال سے ہے) تیسرے درجے یا تیسری منزل (STAGE) کی پراکرتیں کہنا چاہیئے۔ ان تینوں قسموں کی پراکرتوں کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس مقام پر یہ بات اہم بھی ہے اور قابل توجہ بھی کہ ثانوی پراکرت (دوسرے دور کی پراکرتیں) کی بھی اپنی شاخیں تھیں۔ راجہ اشوک کے کتبے اسی پراکرت میں لکھے گئے تھے۔ یہ ثانوی پراکرت بدھ مت سے متاثر ہوئی اور بدھ مت کی تبلیغ اور

اس کے ادب نے اسے بہت اہمیت بخشی اور پھیلایا۔ اس طرح یہ ترقی کر کے پالی زبان کہلائی۔ چنانچہ جب پراکرتوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ثانوی پراکرت کی یہی بعد کی ترقی یافتہ زبانیں ہوتی ہیں جو پالی کے درجہ سے گزر کر ترقی پا چکی تھیں مگر ابھی موجودہ ہند آریائی زبانوں کے مقام تک نہ پہنچی تھیں۔ ان پراکرتوں نے ادب بھی پیدا کیا تھا۔

آریہ جو بولی بولتے ہندوستان میں آئے تھے جب اس بولی کو ادبی اور مذہبی سرپرستی حاصل ہو گئی تو عوام کی بولیوں سے کٹ کر اور جدا ہو کر آہستہ آہستہ سنسکرت بن کر رہ گئی اور اس نے اپنی اصل یعنی عام بول چال سے الفاظ لینے بند کر دیئے۔ اسی طرح جب مختلف پراکرتیں بھی لکھی جانے لگیں اور ان میں بھی ادب پیدا ہونے لگا تو سنسکرت کی طرح ان میں سے ہر پراکرت اپنی اپنی اصل یعنی اپنی اپنی بول چال کی زبان سے دور ہوتی گئی اور ان پراکرتوں نے اپنی اپنی عوامی بول چال سے الفاظ لینے بند کر دیئے اور اس طرح یہ منجمد ہو کر رہ گئیں اور کسی قسم کی تبدیلی قبول نہ کرنے کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ پر ہر پراکرت محدود ہو گئی۔ یہ پراکرتیں تو منجمد اور محدود ہو گئیں مگر یہ جن بولیوں سے نکلی تھیں وہ عام لوگوں کے استعمال میں رہنے کی وجہ سے آگے بڑھتی، ترقی کرتی اور پھیلتی پھولتی رہیں کیونکہ یہ زبانیں بول چال کی عام زبان سے آزادانہ طور پر الفاظ مستعار لیتی تھیں، اس لئے ان میں دیسج قسم کے الفاظ زیادہ ہیں۔

چونکہ دیسج قسم کے الفاظ بول چال کی مقامی بولیوں سے لئے جاتے تھے، اس لئے مقامی اثرات کی وجہ سے ان میں اختلافات تھے یعنی اکثر اوقات ایک لفظ مختلف علاقوں کی بول چال میں مختلف ہوتا تھا (جیسا کہ آج کل بھی بول چال کی زبان کے الفاظ میں ہوتا ہے)، اس طرح پراکرتوں کی مقامی تبدیل شدہ شکلوں کا نام اپ بھرنش (شکستہ یا بگڑی ہوئی بولی) رکھا گیا۔ اس سے مختلف علاقوں کی بولیوں سے مختلف اپ بھرنشیں پیدا ہوئیں۔ ہندی قواعد دانوں نے، یسی ستائیس اپ بھرنشوں

ملہ:- یہ الفاظ تین قسم کے ہیں (۱) تت سم: اصل زبان یعنی سنسکرت کے صحیح الفاظ۔ (۲) تدبھو: ایسے الفاظ جن ابتدائی یعنی اصل زبان کے الفاظ کا جزو ہو یعنی اصل الفاظ میں تبدیلی کر لی ہو۔ (۳) دیسج: ایسے الفاظ جو اصل زبان یعنی سنسکرت سے نہ لئے گئے ہوں۔ غیر آریائی زبانوں کے الفاظ

کی فہرست دی ہے۔

مشہور پراکرتیں:۔ قدیم پراکرتوں میں مشہور پراکرتیں یہ ہیں:۔

۱۔ پالی (۲) جَینیا پراکرت (۳) مہاراشٹری (۴) شورسینی (۵) ماگدھی۔

چند اہم نتائج: مندرجہ بالا بحث سے ذیل کے نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

۱۔ جدید ہند آریائی زبانیں سنسکرت سے ماخوذ نہیں بلکہ ان قدیم بولیوں سے نکلی ہیں جو شمال کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہونے والے آریا بولتے تھے۔

۲۔ قدیم بولیاں یا پراکرتیں نہ سنسکرت سے نکلی ہیں اور نہ اس کی بگڑی ہوئی صورت ہیں، بلکہ یہ ایک ایسی قدیم زبان کا پتہ دیتی ہیں جو سنسکرت بلکہ ویدوں کی زبان سے بھی زیادہ قدیم تھی، اور ایسی بول چال کی زبان تھی جس سے جدید اور قدیم بولیاں یعنی پراکرتیں اور سنسکرت دونوں بیک وقت پیدا ہوئیں۔

۳۔ پراکرتیں ایک دوسرے سے متاثر ہونے کے علاوہ سنسکرت سے بھی متاثر ہوتی رہیں اور غیر آریائی عناصر سے بھی۔ اور سنسکرت بھی باوجود مقدس اور محفوظ زبان ہونے (دوسری زبانوں سے بالکل الگ تھلگ رہنے) کے پراکرتوں سے اثر قبول کرتی رہی۔

۴۔ ادبی پراکرتیں بول چال کی زبانوں سے الفاظ بکثرت لے لیتی تھیں۔ اور یہ دیسج قسم کے الفاظ مختلف مقامات میں مختلف تلفظ اور شکل و صورت رکھتے تھے۔ لہٰذا مقامی اختلافات کی بنا پر ایک پراکرت نے دوسری کو اپ بھرنش یا شکستہ بولی کا لقب دیا۔ یہ اپ بھرنشائیں دوسرے اور تیسرے دور کے سنگم پر ملتی ہیں اور یہ ادبی اپ بھرنشائیں ان عام بول چال کی اپ بھرنشاؤں پر مبنی ہیں جن کے اختتام کے ساتھ قدیم پراکرتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ جدید ہند آریائی بھاشائیں پیدا ہوتی ہیں۔

"ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" کے مصنف ڈاکٹر مہر عبدالحق کا کہنا ہے کہ ملتانی پنجابی زبان کا حصہ ہے اور نہ پنجابی سے نکلی ہے بلکہ ملتانی اور پنجابی دو جدا جدا زبانیں ہیں۔ پنجابی کا تعلق ہند آریائی زبانوں کے اندرونی گروہ سے ہے اور ملتانی کا بیرونی گروہ سے۔ پنجابی اور ملتانی میں

جو مشابہت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجابی ملتانی سے متاثر ہے تاریخ سے ظاہر ہے کہ مختلف اوقات میں لوگوں کے بڑے بڑے گروہ بلکہ فوجیں ملتان سے پنجاب میں آتی رہیں، اور اس طرح ان کی زبان (ملتانی) نے پنجابی کو متاثر کیا۔ اس بات کو ڈاکٹر مہر عبدالحق نے یوں بیان کیا ہے"

پنجابی زبان دو بالکل مختلف بولیوں کے نام سے بنی ہے" ایک قدیم پنشاچہ بولی اور دوسری مدھیہ پردیش کی وہ پراکرت جس سے مغربی ہندی نکلی۔ پنجابی مشرقی پنجاب کی بولی ہے اور آج اس کے مغربی ملحقہ علاقہ میں لہندا کا عمل دخل ہے۔

پنجابی کو عام طور پر مشرقی اور مغربی پنجابی میں تقسیم کر دیا جاتا ہے مگر یہ تقسیم اس غلط فہمی کی بنا پر ہے جو لہندا اور پنجابی کے تدریجی ادغام نے پیدا کر دیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پنجابی اور لہندا بالکل دو مختلف زبانیں ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ ایک نے دوسرے کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس لئے لہندا اور پنجابی کے درمیان حد فاصل قائم کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ لہندا کو مختلف علاقوں کی نسبت سے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسے مغربی پنجابی، جٹکی، اچی (علاقہ اُچ کی زبان) ملتانی اور ہندکی بھی کہا گیا ہے۔

پنجابی کا ذخیرہ الفاظ خالص تدبھو الفاظ پر مشتمل ہے۔ لہندا کے الفاظ (خصوصاً ملتانی میں) زیادہ وسیع ہیں اور تدبھو بہت کم ہیں۔ ملتانی میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔

لہندا ایک علیحدہ زبان ہے جس کی مختلف علاقوں میں مختلف شاخیں ہیں۔ ملتانی زبان لہندا کی شاخ یا بولی نہیں، جس طرح لہندا پنجابی کی شاخ نہیں۔ لسانی اعتبار سے لہندا کا رجحان پنجابی کی طرف ہے اور ملتانی کا سندھی کی طرف، لہندا اور ملتانی کا اشتراک اور پنجابی اور ملتانی کا اشتراک صرف اس وجہ سے ہے کہ ایک وقت میں ملتانی سارے پنجاب پر چھا گئی تھی۔

ملتانی اور اُردو ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اپنی کتاب "ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا نقش ملتانی زبان کے حوالہ سے ابھرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کیونکہ اردو زبان مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل ملاپ سے پیدا ہوئی اور ان دو قوموں کا ملاپ ۷۱۱ء میں سندھ میں ہوا جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا اور محمد بن قاسم نے ۷۱۴ء میں ملتان فتح کیا۔ اس وقت سے لے کر محمود غزنوی کے ہند و ملتان

پر حملوں تک مسلمان ملتان کے علاقہ میں کوئی تین سو برس تک ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہے اور ایک قوم نے دوسری قوم سے بہت اثر قبول کیا۔ اس صورت میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی لین دین کے لئے ایک دوسرے کی زبان کو جاننا اور اس طرح دونوں زبانوں میں تصرفات ہونے سے ایک نئی قسم کی زبان کی بنیاد پڑ گئی۔ جب محمود نے ملتان فتح کیا تو یہاں سے بہت سے لوگ اس کی فوج میں شامل ہو کر لاہور پر حملہ آور ہوئے اور اسے فتح کر کے یہیں مقیم ہو گئے۔ یہ لوگ جو زبان بولتے آئے تھے یہاں (لاہور میں) اس نے پنجابی کا بھی اثر قبول کیا۔ اور اس طرح اس زبان کے خد و خال بتدریج واضح ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ یہ زبان بولنے والے ۱۱۹۳ء میں دہلی پر حملہ آور ہوئے اور اسے فتح کر کے وہیں رہ پڑے۔ اس زبان نے دہلی اور اس کے گرد و نواح کی بولیوں سے بھی اثر قبول کیا اور اس طرح اردو ایک منزل اور آگے بڑھ گئی۔

مذکورہ بالا واقعات کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو زبان کی ابتداء ملتان سے ہوئی تھی اور پنجاب کو اس کے بعد اس کی تشکیل کا موقع ملا کیونکہ مسلمانوں کے محمود غزنوی کے ہمراہ لاہور میں آنے سے پہلے مسلمان تقریباً تین سو برس سے ملتان میں ہندوؤں کے ساتھ رہ رہے تھے اور اس طرح چوبیس گھنٹے کے باہمی اور مسلسل میل ملاپ سے ایک زبان کا ہیولا تیار ہو چکا تھا جس نے بعد میں اردو کی شکل اختیار کر لی۔

اردو کے ملتان سے آغاز پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اردو میں فارسی الفاظ کی اکثریت ہے اور سندھ اور ملتان کو فتح کرنے اور وہاں حکومت اور سکونت اختیار کرنے والے عربی بولتے تھے۔ یہ اعتراض اس وقت غلط ثابت ہو جاتا ہے جب ہم ان علاقوں میں آنے والے ان سیاحوں کے بیانات پڑھتے ہیں جو ہجری کی ابتدائی صدیوں میں یہاں آئے۔ ان میں سے اکثر نے یہ لکھا ہے کہ ملتان میں لوگ ملتانی کے علاوہ عربی اور فارسی بھی بولتے تھے۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے لکھا ہے:

"فتح سندھ[1] کے بعد جب براہ راست عرب قبائل نے اس ملک میں توطن اختیار کر لیا اور

---

[1] اس وقت ملتان سندھ کا ایک حصہ تھا۔ ملتان ۱۱۱ھ میں سندھ سے جدا ہو گیا اور انگریزوں کی آمد تک جدا رہا پھر اس وقت سے اب تک پنجاب میں شامل ہے۔

عنانِ حکومت عربوں کے ہاتھ میں آگئی تو سندھ کی زبان کا عربی سے مخلوط ہو جانا کچھ بڑی بات نہیں۔ ایرانی افواج جو عرب فاتحین کے ساتھ یہاں داخل ہوئیں اپنے ساتھ فارسی زبان لائیں۔ لیکن یہ فارسی ژند واوستا کی فارسی نہ تھی۔ بلکہ عربی سے متاثر ہو کر عربی زدہ ہو چکی تھی۔ اور چونکہ (یہ فارسی) آریاؤں کی اصل زبان سے مختلف نہ تھی۔ اس لئے اس نئی زبان (فارسی) کے قبول کرنے میں بھی دیر نہ کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی زبان باوجود اس کے کہ اس کا لسانی تعلق ہماری زبان سے بہت دور کا ہے، ہماری زبان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی ہے حالانکہ اس کا قیام اس ملک میں ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ نہیں رہا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ عربی اور عربی زدہ فارسی، جن کے براہ راست تعلقات یہاں کی زبان سے صدیوں سے چلے آئے تھے، یہاں کی بول چال کی زبان نہ بنتی۔ مثل مشہور ہے کہ کلام الملوک ملک الکلام یعنی بادشاہوں کی زبان زبانوں کی بادشاہ ہوتی ہے۔ عربوں نے وادی سندھ یعنی ملتان کے صوبہ سے ساحل سمندر تک سوا تین سو سال حکومت کی اور ملتان، اُچ اور منصورہ علم و فن کے بہت بڑے مراکز تھے۔ اس کے بعد محمود غزنوی کی فتوحات نے مرکز ثقل کو ملتان سے لاہور اور لاہور سے دہلی منتقل کر دیا۔ لہٰذا ان تین صوبوں میں عربی (اور قدرے فارسی) کا عروج حاصل کرنا اور عوام کی بول چال تک میں آجانا بعید از فہم نہیں۔"

ہند آریائی زبانوں نے عربی و فارسی کے کئی ایک الفاظ کو اپنے لب و لہجہ کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ مثلاً:

خون کو کھون، خدا کو کھدا، نماز کو نماج، مرغ کو مرگا، کاغذ کو کاگد، زمین کو جمین، ہوش کو ہوس، وقت کو وخت، خیر کو کھیر، بزاز کو بجاج، جہاز کو جہاج، مطلب کو مطبل وغیرہ۔

ملتانی زبان میں چونکہ عربی اور فارسی الفاظ نسبتاً زیادہ تعداد میں داخل ہوئے ہیں اور اس علاقہ میں عربی اور فارسی بول چال کی زبان رہی ہیں۔ جب کہ دوسرے علاقوں میں یہ بول چال کی زبانیں نہیں رہیں بلکہ محض دفتری اور سرکاری زبان رہی ہیں۔ اس لئے ان زبانوں کے الفاظ نے یہاں کے ملکی اثرات زیادہ تیزی سے قبول کئے بعد میں یہ اثرات پنجاب تک پہنچے اور اس طرح

اردو زبان نے اپنی تشکیل میں ایک اور قدم اٹھایا۔

ملتان میں دیسیج یعنی غیر ہند آریائی زبانوں کے الفاظ کی بہت زیادہ کثرت ہے ملتانی زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمو لینے کی قوت بہت زیادہ ہے اور فارسی الفاظ پر یہ قوت بہت زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ لہذا ملتانی زبان نے عربی اور فارسی الفاظ کو اپنے اندر سموتے وقت ان کی اس طرح تراش خراش کی ہے کہ بعض اوقات لسانی تجزیہ بھی اصل لفظ کا پتہ نہیں لگا سکتا۔ مثلاً ایسے بے شمار الفاظ میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں۔

لفظ (عربی، فارسی)	معنی	لفظ (ملتانی)	معنی
ابتر (ع)	بے اولاد	آونترا	بے اولاد
اخوند زاد (ف)	استاد کا بیٹا	آخن زادہ	استاد کا بیٹا
آختہ (ف)	خصی	آختہ۔ اختہ	پریشان، بیزار
آزار (ف)	دکھ، درد	ازار	درد
آفتابہ (ف)	لوٹا	اَستاوہ	مٹی کا لوٹا
اریحائی (ع)	اریحا کا رہنے والا	ارائیں	ایک مشہور ذات کا نام
باخر (ف)	کچھوا	باغوں	دریائی بھیڑیا
برنا (ف)	جوان، گھبرو	بنّاں	جوان، گھبرو۔
بَصل (ع)	پیاز	وسّل	پیاز
پاتیلہ (ف)	کھلے منہ کا دیگچہ	پتیلہ	کھلے منہ کا دیگچہ
بیعانہ (ع)	قیمت خرید کا پیشگی حصہ	بیانہ	قیمت خرید کا پیشگی حصہ
پارار (ف)	گذشتہ سال	پَرہ	گزشتہ سال
پازار	کسان کے پہننے کا ایک قسم کا جوتا	پرار	جوتے کا ایک پاؤں
پینکی (ف)	اونگھ، غنودگی	پنکی	نشہ، سرور
پیشین (ف)	نمازِ ظہر کا وقت	پیشین	نماز ظہر کا وقت

لفظ (عربی، فارسی)	معنی	لفظ (ملتانی)	معنی
تابوت (ف)	مُردے کا صندوق	تبوت	تعزیہ
ترقیدن (ف)	پھٹنا	تَرَکَن	بدبُودار ہونا
تعویذ (ع)	خدا کی پناہ چاہنا	تَوِیذ	گنڈا، ایک زیور کا نام، قبر کی تختی
تفرقہ (ع)	اختلاف، پھوٹ	ترلیفوتی	نفاق، پھوٹ
تُکمہ (ف)	گریبان کا کپڑے کا بنا ہوا بٹن	تُکماں	گریبان کا کپڑے کا بنا ہوا بٹن
ثُوم (ع)	لہسن	تھوم	لہسن
داغ (ف)	داغ	دانگ	داغ، دھبہ
دَغ (ف)	چٹیل زمین	دَگ	چٹیل زمین، راستہ۔
دق (ع)	ویرانہ	دَک	ویرانہ، غیر آباد زمین
دیّوث (ع)	بھڑوا	دَوُت	بھڑوا
دیانت (ع)	ایمانداری	دانت	عقل، سمجھ بوجھ
رخنہ (ف)	سوراخ	رخنہ	رکاوٹ، درز، سوراخ
رده (ف)	صف، قطار	رَدّا	اینٹوں کی قطار

عربی اور فارسی نے نہ صرف ملتانی کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا ہے بلکہ زبان کے ڈھانچے کو بھی کافی حد تک بدل دیا ہے۔ اس کے لئے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

عَقّن (عاق کرنا سے) عَقاون بمعنی تنگ کرنا، ناک میں دم کرنا وغیرہ

نیتن (نیت سے) نیت کرنا، ارادہ کرنا۔

دَمّن (دم سے) دم رکھنا، کچھ پڑھ کر پھونک مارنا۔

قصُورن (قصور سے) بیمار ہونا۔

ہَرجن (ہرج سے) بیمار پڑ جانا، تکلیف ہونا۔

اَزارن (آزار سے) تکلیف دینا۔

خلقن (خلق سے) بخشنا، عطا کرنا۔
طَہورن (طہور سے) ختنہ کرنا۔
مَستن (مست سے) مست ہونا۔
خبراون (خبر سے) خبر کرنا، اطلاع دینا۔
نجرن یا بجھرن (نزار سے) نزار ہونا۔
غرقان۔ غرقیجن (غرق سے) ڈبونا، ڈوبنا، گھونپنا۔
باکن (باکی سے) گریہ وزاری کرنا۔
ترُکن (ترقیدن سے) بدبودار ہونا۔
سَڈن (صدا سے) بلانا۔
قرقن (قرق سے) مرغی کی آواز۔
گُنجن (کنج سے) آستین چڑھانا۔
ہینگن (نہیق سے) گدھے کا آواز نکالنا۔
ہُملن (ہملان سے) زار زار رونا۔
نظرن (نظر سے) دکھائی دینا۔

ملتانی زبان کے لاحقے: افعال کی گردن میں ملتانی زبان جو فاعلی لاحقے استعمال کرتی ہے یہ بھی ایرانی اثر کی وجہ سے ہے، مثلاً:-

ملتانی	فارسی	معنی
کھادئی	خوردی	تو نے کھایا۔
کھادائی	خوردہ ای	تو نے کھایا ہے۔
کھادُم	خوردم	میں نے کھایا۔
کھادائم	خوردہ ام	میں نے کھایا ہے۔

عربی و فارسی میں کلماتِ ایجاب و انکار: عربی میں ہاں کے لئے "بلے" ہے اور فارسی میں "بلے"۔ ملتانی میں "بھلا" کہتے ہیں۔ فارسی کے "نہ" اور "نیست" ملتانی میں "نہ" اور "نِیتا" ہیں

گئے ہیں۔ کلمۂ استفہامیہ "چہ" فارسی سے ملتانی میں آیا ہے۔ مثلاً۔

ملتانی	اردو
چہ تھی پیا	کیا ہو گیا
چہ کردں	کیا کروں

کسی زبان کی شناخت: زبانیں صرف اپنے ذخیرہ الفاظ ہی سے نہیں پہچانی جاتیں بلکہ زبان کی ساخت کا دارومدار اس کے حروف و افعال کے علاوہ الفاظ کی ترتیب اور نشست پر بھی ہے۔ ملتانی زبان میں جملہ کی بناوٹ اور اس میں الفاظ کی ترتیب فارسی جملہ کی بناوٹ اور ترتیب کے مطابق ہے۔ مثلاً

ملتانی	فارسی	اُردو
او آندا پئے	او آمدہ شود	وہ آرہا ہے
او آندا ہا	او آمدہ بود	وہ آیا تھا۔
آکھیم	گفتہ ام	مَیں نے کہا ہے
کھاوئ	خوردہٗ	تُو نے کھایا ہے
نہیں جاندا	نمے دانم	میں نہیں جانتا۔
وَنجن ڈے	رفتن دہ	جانے دے۔

اس لحاظ سے ملتانی اور اردو ایک جیسی ہیں۔ دونوں میں ترتیب الفاظ اور جملے کی ساخت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ صرف آخری فقرے میں ملتانی اور فارسی نے مصدر کو بغیر تصریف کے استعمال کیا ہے اور اردو نے مصدر کے آخری الف کو ے سے بدل دیا ہے۔

ملتانی زبان کا تعلق سندھی، عربی، فارسی اور بلوچی سے ہے۔ چونکہ ملتان کے علاقہ کی آبادی کی اکثریت ان بزرگوں کی اولاد ہے جو عرب اور ایران سے آئے تھے، اور یہاں آکر انھوں نے توطن اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے عربی فارسی زبانوں کو بھی اس علاقہ سے خصوصی تعلق رہا اور اب بھی ہے۔

اردوئے قدیم اور ملتانی

اردوئے قدیم میں ملتانی زبان کے الفاظ اور تراکیب ملتی ہیں۔ یہاں مشہور شعرائے اردو کے کلام سے ملتانی الفاظ وتراکیب کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

امیر خسرو:۔ بھائی رے ملاحو ہم کوں پار اتار
ہاتھ کا دیوونگی مُندرا گل کا دیوونگی ہار
بابل بھیجی میں ونج کوں تاندا کو بھجھ ل
ہوچھا ونج دیا جیا ناں لدھا مُول

ان دوشعروں میں خط کشیدہ الفاظ یعنی "کوں" "مُندرا"، "گل"، "بابل" "ہوچھا" "دیا جیا" خالص ملتانی ہیں۔

خالق باری:۔ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے یا نہیں ہمیں یہاں اس سے کوئی سروکار نہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خالق باری ایک قدیم کتاب ہے اور اس میں ملتانی زبان کے کئی الفاظ ملتے ہیں ایسے کچھ الفاظ نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

ملتانی الفاظ	معنی	ملتانی الفاظ	معنی
مری	دیا	کلہ	کل
کت	کہاں	جانگھ	ٹانگ
کاٹھی	لکڑی	پاہنا	مہمان
نینہہ	عشق	سواد	مزا
وردہ	عذر، جھوٹ	کہاڑہ	کلہاڑا۔
تاتا	گرم	آکھو	کہو
جیبھ	زبان	نیڑا	نزدیک
لون	نمک	اندھاری	اندھیری
سانجھ	شام	آنیے	لائیے (لائیں)

بھگت کبیر:۔ بھگت کبیر کے ہاں ایک مقام پر "ٹھیکیں" بمعنی منع کرنا ملتانی لفظ آگیا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

آن کو تیاگیں من کو نہ ہٹکیں، پارن کریں سگوئی

بھگت کبیر کی ایک نظم کا پہلا مصرع اس طرح ہے

سنتو راہ دونوں ہم ڈیٹھا

اس کے معنی یہ دیئے گئے ہیں۔ او بھلے لوگو! "میں نے دونوں کا راستہ دیکھ لیا۔" میں نے دیکھ لیا "ڈٹھا ہم" کا ترجمہ ہے اور یہ ترکیب سوائے ملتانی کے اور کہیں نہیں۔

"چھیک" یعنی سوراخ ملتانی لفظ ہے۔ کبیر نے اسے ایک دوہے میں استعمال کیا ہے۔

(دوہا) کبیرا بیڑا اجرجرا پھوٹے چھیک ہزار

ہلکے ہلکے تر گئے ڈوبے جن سر بار

سلطان علی قطب شاہ:

کس ٹھار میں دِستا نہیں سب ٹھار ہے بھرپور

دیکھیں کون سکت کان اسے ٹیک نیں ہے

خط کشیدہ لفظ "دِستا" بمعنی "نظر آتا"، ملتانی ہے۔

قلی اللہ:۔

جنے سائیں کے عشق کا مدپیا ہے

نکرسی او سے ہور مستی او تارا

سکی پیو چنتا لگیا ہے ہمیں کو

سجن بن نکرسی ہے ہوا کوئی نوارا

خط کشیدہ الفاظ میں نکرسی بمعنی نہ کرے گا۔ فعل مستقبل میں "سی" کا استعمال ملتانی طریقہ ہے۔ نیز لگیا بمعنی لگا بھی ملتانی ہے۔

طوالت سے بچنے کے لئے مزید ایسی مثالوں سے احتراز کرتے ہوئے صرف یہ کہنا کافی ہوگا۔ ملتانی زبان کے الفاظ تراکیب اور ملتانی جمع کے طریقے قدیم شعراء میں سے وجہی، غواصی، جنیدی، امین، غلام علی، ابراہیم عادل شاہ، خوشنود، نصرتی،

شاہ ملک، لطیف، ولی اورنگ آبادی، مبارک شاہ آبرو، مرزا جان مظہر، سعادت علی، محمد شاکر ناجی، محمد یار خاکسار، محمد فقیر، محمد قاسم، میر تقی میر کے ہاں ملتے ہیں۔

ملتانی اور اردو کے قواعد

ملتانی اور اردو کے صرف ونحو کے اکثر قواعد ایک طرح کے ہیں۔ "پنجاب میں اردو" کے مصنف مولانا محمود شیرانی نے لکھا ہے۔

"اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسما و افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں"۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اسما وصفات کی تصریف: اسما وصفات جمع و واحد اور تذکیر و تانیث میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔

ملتانی	اردو
اُچّا گھوڑا	اُونچا گھوڑا
اُچے گھوڑے	اُونچے گھوڑے
اُچی گھوڑی	اُونچی گھوڑی
اُچیاں گھوڑیاں	اُونچی گھوڑیاں

جمع مؤنث کی مثال میں اردو نے اونچی استعمال کیا ہے اونچیاں استعمال نہیں کیا۔ یہ بقول علامہ محمود شیرانی بے قاعدگی ہے جو میر و سودا کے عہد سے شروع ہوئی، ورنہ ان کے زمانہ تک یہ فقرہ ملتانی ہی کے مطابق تھا جیسے ؎

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہیں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں (سودا)

فعل کی تصریف:۔ اسما وصفات کے علاوہ فعل بھی ملتانی اور اردو دونوں میں بلحاظ

تذکیر و تانیث اور واحد و جمع اپنے فاعل کے مطابق آتا ہے، جیسے۔

اردو	ملتانی	اردو	ملتانی
گھوڑا آیا	گھوڑا آیا	گھوڑے آئے	گھوڑے آئے
گھوڑی آئی	گھوڑی آئی	گھوڑیاں آئیں	گھوڑیاں آئیاں

یہاں بھی جمع مؤنث میں اُردو نے پرانے طریقے کو چھوڑ دیا جو ملتانی کے مطابق تھا. مثلاً سودا کا ایک شعر ہے ؎

گھنی نکلی ہیں لختِ دل سے تارِ اشک کی لڑیاں
یہ انکھیاں کیوں میرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

ماضی مطلق: ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے جیسے۔

اردو	ملتانی	اردو	ملتانی
وہ آیا	او آیا	وہ آئے	او آئے
تُو آیا	تُوں آیا	تم آئے	تساں آئے
مَیں آیا	مَیں آیا	ہم آئے	اساں آئے

جمع مؤنث کے تینوں صیغے ملتانی میں آئیاں ہیں۔ موجودہ اردو میں آئیں ہیں۔ مگر یہاں بھی اصلاحی کوششوں سے یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے، ورنہ پرانی اردو ملتانی کے مطابق تھی، جیسے ابن دکنی کا شعر ہے ؎

مصر میں خوب صورت بیبیاں تھیاں
انوں سنیا زلیخا کی سو باتاں

حالِ تمام: حالِ تمام بھی دونوں زبانوں میں تقریباً ایک ہے۔ جو فرق ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ملتانی کا فعل فاعل نما ہے اور اس لئے اس کی تصریف کی گئی ہے جیسے

اردو	ملتانی	اردو	ملتانی
وہ آیا ہے	او آیا ہے	وہ آئے ہیں	او آئے ہن
تُو آیا ہے	توں آیا ہے	تم آئے ہو	تساں آئے ہو

اردو	ملتانی	اردو	ملتانی
مَیں آیا ہوں	مَیں آیا ہاں	ہم آئے ہیں	اساں آئے ہیں

اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم یہ کہیں گے کہ اردو اور ملتانی صرف و نحو کے دیگر قواعد بھی اکثر و بیشتر ملتے جلتے ہیں اور کہیں کہیں معمولی اختلافات بھی مل جائیں گے جو خاص قابل توجہ نہیں ہیں۔

ملتانی اور اردو کا ایک بہت بڑا تعلق یہ بھی ہے کہ اردو کا ذخیرہ الفاظ جن چشموں کا مرہون احسان ہے ملتانی زبان کا ذخیرہ بھی انہی چشموں سے فیض یاب ہوا ہے۔

اردو کی ابتدا کے حوالہ سے ملتانی زبان کی حقیقت

علامہ شیرانی کا نظریہ: علامہ محمود شیرانی اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں کہتے ہیں۔ کہ ہمارے مؤرخ یہ امر فراموش کر جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان اور اہل ہندوستان کے ساتھ پرتھی راج کی شکست اور فتح دہلی کے زمانہ سے شروع نہیں ہوتے، بلکہ ان واقعات سے کئی صدی پیشتر سے ابتدا پاتے ہیں۔ وہ عربوں کی فتح سندھ و ملتان اور غزنوی خاندان کی فتح پنجاب کو مطلق فراموش کر جاتے ہیں۔ سندھ اور ملتان پر مسلمان پہلی صدی ہجری سے قابض تھے۔ پنجاب پر ان کا قبضہ معزالدین محمد سام کی آمد سے ایک سو ستر سال پہلے سے تھا۔ سندھ اور پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں، اس لئے انھیں اگر ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی ہوگی اور اردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیئے۔

محمود شیرانی مزید کہتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر بطور وطن رہنا اختیار کر لیا تھا۔ ہمارے مصنفین کا ایک اور مزعومہ خیال یہ ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ کوئی اسے برج بھاشا کی بیٹی بتاتا ہے اور کوئی اس کے دودھ سے اس کی پرورش کرتا ہے۔

اردو زبان کی ابتدا کے سلسلہ میں محمد شیرانی کا فیصلہ ہے کہ واضح ہوتا ہے کہ ہندی اور ایرانی تمدن کا سنگم سندھ و ملتان میں غزنوی عہد سے پیشتر ہو چکا تھا۔

سید سلیمان ندوی کی رائے: سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "نقوش سلیمانی"، میں لکھا ہے کہ مسلمان کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے پھر پنجابی اور بعد ازاں دہلوی، سندھی، پنجابی اور ملتانی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہے۔ تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے۔ تینوں میں عربی و فارسی لفظوں کا میل ہے۔ صرف صیغوں کے طریقوں میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضروری ہے جس کی رو سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا۔ اور آگے چل کر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی۔

پیر راشدی صاحب کا خیال: پیر راشدی صاحب کا کہنا ہے کہ[۱] ابتدائی دور میں عراق اور عرب سے ہزاروں خاندان سندھ میں آ کر بسے اور دیبل سے ملتان تک ان کی بستیاں چھاؤنیاں اور نو آبادیاں پھیلتی چلی گئیں۔ پھر ان علاقوں سے جو اب افغانستان اور سیستان میں داخل ہیں کثیر مقدار میں سپاہی اور کوہی، شہری اور دیہی گروہوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ ان سے بعید علاقوں کے لوگوں کی بڑے پیمانے پر ایک نقل مکانی وہ تھی جو یورش تاتار کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئی۔

راشدی صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ قدیم سندھی اور مغربی ہند کی بولیوں نے اسلامی زبانوں کا سب سے پہلے اثر قبول کیا اور کچھ شک نہیں کہ سندھی اور ملتانی ہی ہیں

۱۔ رسالہ اردو جلد ۳۰ نمبر ۲ بابت اپریل ۱۹۵۰ء انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ص ۱۰ بحوالہ مضمون اردو زبان کا اصلی مولد سندھ از جناب سید حسام الدین صاحب راشدی۔

اردو کا بیج پڑا۔ تاریخی طور پر بھی ابتدائی اردو کی بول چال کی زبان بن جانے کا سب سے قدیم اور پہلا ثبوت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کا وہ مختصر مطالعہ ہے جو ان کے قریب العصر تذکرہ سیر الاولیاء اور دوسری تاریخوں سے ہم تک پہنچا ہے۔ حضرت فرید الدین گنج شکر کی ولادت ۵۶۹ھ (۴۔۱۱۷۳ء) ہے جب کہ مسلمانوں کا قبضہ سندھ و پنجاب سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ حضرت ملتان کے ایک گاؤں کھوت وال میں پیدا ہوئے، ملتان کے علاقہ میں تعلیم پائی اور وہیں وفات پائی۔

شیخ محمد اکرم کی رائے: شیخ محمد اکرم اپنی کتاب آب کوثر میں لکھتے ہیں کہ سندھ اور ملتان کے بعد شمالی ہندوستان میں ہدایت کا سرچشمہ سب سے پہلے (حضرت داتا گنج بخشؒ کی وجہ سے) لاہور میں پھوٹا۔ اس سے پیشتر لاہور بقول حضرت داتا گنج صاحب، ملتان کے مضافات میں ایک تھا۔ مرکزِ ثقل ملتان سے دہلی کی طرف منتقل ہوا تو سینکڑوں ہزاروں قبائل دہلی کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ اور اس طرح وادیٔ سندھ میں (ہندو مسلم ملاپ سے) پیدا ہونے والی نئی زبان دار السلطنت میں پہنچ گئی۔ جن قبائل نے دہلی میں یا اس کے گرد و نواح میں جا کر توطن اختیار کیا۔ وہ اسی نئی بولی کے بولنے والے تھے (جو بعد میں اردو کہلائی) اور صدیوں سے وادیٔ سندھ میں رہتے چلے آئے تھے۔

پروفیسر سینتی کمار چیٹرجی کا بیان: پروفیسر سینتی کمار چیٹرجی کا کہنا[1] ہے کہ ترکی اور ایران فاتحین کے جلو میں جو پنجابی مسلمان دہلی میں آئے، ان کو دار السلطنت میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ وہ نئے دار السلطنت میں اپنی بولی لائے اور ان کی بولی نے جو کہ دہلی کی شمالی اور شمال مغربی اضلاع کی بولیوں سے ملتی جلتی تھی، یہاں کی زبان کو متاثر کیا اور یہ نئی زبان دار السلطنت کی کاروباری زبان بن گئی۔

ڈاکٹر سید محی الدین زور کی رائے: محی الدین زور لکھتے ہیں کہ زبان[2] اردو کا زبان پنجابی سے

---

[1] انڈو ایرین اور ہندی از پروفیسر سینتی کمار چیٹرجی شائع کردہ ورنیکولر ریسرچ سوسائٹی گجرات۔

[2] ماہنامہ نقوش "لاہور"، جولائی ۱۹۵۳ مضمون "اردو اور پنجابی"۔

جتنا قدیم اور جتنا گہرا تعلق ہے اتنا کسی اور زبان سے نہیں ہے۔ اردو دنیا کی ایک ایسی عجیب غریب زبان ہے جو ہمیشہ غلط فہمیوں میں گھری رہی اور جس کو اپنوں اور بیگانوں نے اس کی بے تعصبی، ہمہ گیری اور باہمہ اور بے ہمہ رہنے کے باوجود ہمیشہ نقصان پہنچانے ہی کی کوشش کی۔ اس کی شکل و صورت ہر دور میں بہت سوں کو دھوکا دیتی رہی ہے۔ اسی طرح اس کے آغاز و ارتقا کی نسبت بھی بڑے بڑے ادیب اور محقق اکثر بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے ہیں۔ اور بعض اب تک بھی بھٹک رہے ہیں۔ اس گمراہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے پنجابی زبان کے اس حصے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو اس نے اردو کے بننے اور ترقی کرنے میں ادا کیا۔ بعض لوگ غلط فہمی یا مقامی تعصب کی وجہ سے اردو کو ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ یہ ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منزل پر نت نئی نئی غلطیوں کو گوارا کر لینا پڑتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی بن کر بلند پایہ صاحبانِ فضل و کمال کو بھی گمراہ کر دیتا ہے جس زمانہ میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کی زبان میں بہت کم فرق تھا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں ۱۹۲۸ء کے بعد سے اہل اردو اور ماہرین لسانیات کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی رہے) اور اردو کے سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اور لسانیاتی نشو و نما حاصل کرنے کا نظریہ مستحکم اور مسلم الثبوت بن گیا (ہے)

یہاں پر یہ یاد رکھنا از حد ضروری ہے کہ پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اردو زبان کی ابتدا کا جو بیج پنجاب آ کر اگتا ہے اس کا آغاز اس سے صدیوں پہلے ملتان میں ہو چکا تھا اور یہ بیج ملتان ہی سے پنجاب آیا اور یہاں سے دہلی گیا اور بعد میں ترقی پا کر اردو زبان کا نام پایا۔

چند مشترک امور: مندرجہ بالا بیانات اردو کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں جو باتیں مشترک ہیں اور قطعی طور پر تسلیم شدہ ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ فارسی اور عربی کا اختلاط سب سے پہلے وادیٔ سندھ میں ہوا۔

۲۔ یہ اختلاط محمود غزنوی کی آمد سے پہلے تین سو سال کے اس عرصے میں ہو چکا تھا، جس کی صحیح تاریخ ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی اور جو اس وقت کے لٹریچر کے ناپسند ہو جانے کی وجہ سے عہدِ تاریک کہلانے کا مستحق ہے۔

۳۔ دہلی میں ایک نئی زبان پہنچی جو غالباً پنجاب میں پیدا ہوئی تھی۔۱

ان حقائق کے پہلو بہ پہلو ہمنے لسانی اور تاریخی دلائل سے جو بات ثابت کی ہے وہ یہ ہے کہ۔

ہمارا نظریہ: وادی سندھ میں عربی، فارسی، بلوچی، ترکی وغیرہ زبانوں کے اختلاط سے جو نئی زبان پیدا ہوئی وہ یہی زبان تھی جسے ہم آج ملتانی کہتے ہیں۔

۲۔ صوبہ ملتان ملک سندھ کا ترقی یافتہ صوبہ تھا۔ ۱۱۱ھ مطابق ۷۳۰ء سے خود مختار بن گیا تھا۔ اور یہاں کا تمدن ہندو مسلم اتحاد کی بے نظیر مثال تھی جیسا کہ عرب سیاحوں نے شہادت دی ہے۔

۳۔ یہ نئی زبان جو وادیٔ سندھ کے شمالی اور ترقی یافتہ حصے میں تیار ہوئی، یہاں سے چل کر لاہور پہنچی۔

۴۔ پنجاب میں اس نئی زبان پہ پنجابی نے اثر ڈالا اور اس کی ہیئت اور بدل گئی اور یہ دو آتشہ بن گئی۔

۵۔ یہ دو آتشہ زبان دہلی اور اس کے نواح میں پہنچی تو وہاں کی زبانوں نے اس پر اتنا اثر ڈالا کہ ان بولیوں میں ضم ہو کر رہ گئی اور ایک نئی زبان اردو کے نام سے عالم وجود میں آگئی۔

ضروری:۔ ہم اس بات کے قائل نہیں کہ ملتانی اردو کی ماں ہے یا اردو ملتانی سے نکلی ہے، بلکہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے دو قوموں میں سب سے پہلے اختلاط و میل جول وادی سندھ میں ہوا، اور محمود غزنوی کی آمد سے پہلے کے تین سو سالوں میں ملتانی زبان معرضِ وجود آ چکی تھی۔ محمود غزنوی اور ما بعد کے فاتحین کے لشکر یہی زبان لے کر لاہور اور پھر لاہور سے دہلی پہنچے، چنانچہ دہلی اور اس کی نواح کی زبانوں پہ پنجابی کے اور پنجابی پر ملتانی کے اثرات نہایت واضح اور نمایاں ہیں۔

لسانیات کے مقاصد

اُردو[1] ہندی کے سلسلہ میں ایک عام فہم غلط فہمی یہ ہے کہ ہندی اور برج بھاشا کو ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ سمجھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اُردو ہندی سے نکلی، حالانکہ یہ دونوں غلط ہیں۔ نہ تو اُردو برج بھاشا سے نکلی اور نہ برج بھاشا کا نام ہندی ہے۔ ہندی اُردو کی اس جدید ترین شاخ کا نام ہے جو فورٹ ولیم کالج کے قیام (انیسویں صدی کے آغاز) کے بعد سے ناگری رسم الخط میں لکھی جانے لگی ہے اور جس پر فارسی اور عربی کی جگہ برج بھاشا اور سنسکرت کا زیادہ اثر ہے۔ برج بھاشا وہ زبان ہے جو مسلمانوں کی فتح دہلی کے وقت سے سرزمین برج میں شعر و شاعری کے لیے مستعمل ہے۔

لسانیات اس علم کو کہتے ہیں کہ جس کے ذریعہ سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقاء، زندگی اور موت کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا زبانوں کا

---

[1] ہندوستانی لسانیات - از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

تجزیہ اُن کی تاریخ، اُن کے باہمی نقاط ارتباط، ان کی معنوی ساخت اور ان کی ظاہری تقسیم اور گروہ بندی پر غور و خوض کرنا لسانیات کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ چونکہ زبان لفظوں سے بنتی ہے اس لیے لسانیات کا تعلق بالعموم لفظوں ہی سے ہوتا ہے۔

اس کے فوائد: صرف اساتذۂ السنہ ہی کو لسانیات سے دلچسپی نہیں بلکہ بعض دیگر علوم و فنون کے ماہرین کو بھی اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ نفسیات، فلسفہ، عمرانیات اور بشریات پر تحقیق و تفتیش کرنے کے سلسلہ میں لسانیات کی مدد کئی طرح سے ناگریز ثابت ہوتی ہے۔

ماہرین نفسیات ابتدا میں لسانی طرز ارتقاء کی طرف زیادہ متوجہ نہیں تھے، مگر اب زبانوں کے تجزیہ کی طرف خاص احتیاط اور توجہ کے ساتھ مائل ہو گئے ہیں تاکہ انسانوں کی عادات و روایات وغیرہ پر کامیابی کے ساتھ روشنی ڈالی جا سکے۔

فلسفیوں نے بھی اس طرف خاص توجہ کی ہے۔ انھوں نے زبان اور خیال کے باہمی تعلق کی نسبت گہری دلچسپی ظاہر کی ہے، اور علم اور تجربوں کی جماعت بندی اور عاداتی اور روایتی اشاروں کے ساتھ معانی و مطالب کے تعلق پر بحث کرنے کے سلسلہ میں اصولِ لسانیات سے مستفید ہوئے ہیں۔

ماہرینِ عمرانیات اور بشریات کو لسانیات سے اس لئے دلچسپی پیدا ہوئی کہ انسانوں کی اجتماعی خصوصیتوں اور مدنیتوں کے سمجھنے کے لئے لسانی مسئلہ سب سے پہلے قابلِ غور سمجھا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ جملہ تاریخی تحقیقات سے بھی لسانیات کا مطالعہ عملی طور پر فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ قدیم قوموں کے عادات و اطوار اور رسم و رواج کی نسبت معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قدیم زبان ہے، جس کے پراگندہ

نمونے ان قوموں کے باقی ماندہ افراد کے سینوں میں صدیوں بعد تک محفوظ رہتے ہیں اور جو لسانیات کی مدد سے منضبط اور منظم ہو کر تشریح حاصل کرتے ہیں۔

مختلف قوموں کی تاریخ اور ماقبل تاریخی حالات کا اندازہ کرنے میں لسانیات سے زیادہ مفید کوئی اور علم ثابت نہیں ہوا۔

تقابلی لسانیات کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جبکہ یونانی اور لاطینی زبانوں کا ایک مشترک ماخذ قرار دینے کے خیالات یورپ کے حکماء میں بار بار پیدا ہوئے اور یہ بات ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں کہ ان کا ماخذ عربی زبان ہے۔ آخرکار ایک انگریز جونس نے ۱۷۸۶ء میں اپنی لسانی تحقیقات سے ثابت کیا کہ لاطینی یونانی، گوتھک، سنسکرت اور کلٹک زبانوں کا ماخذ ایک ہے اور وہ ہے آریائی

زبان کیونکر پیدا ہوئی؟ انسانی خیالات اور احساسات کے لئے زبان کیونکر پیدا ہوئی؟ یہ مسئلہ عظیم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ زبان کے آغاز یا دوسرے الفاظ میں دنیا کے اہم لسانی خاندانوں کے آغاز پر تحقیق و تفتیش کرنے کے لئے آج بہت کم مواد موجود ہے، کیونکہ بعد کے زمانہ کے حالات اور ارتقائی واقعات نے ابتدائی شکلوں پہ ایسا پردہ ڈال دیا ہے جس کا دور کرنا عہد حاضر کے محققین کے بس کی بات نہیں۔ دنیا کی مختلف لسانی شاخیں اپنی جدا جدا اور آزاد خصوصیتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر دور ہیں کہ انھیں ایک ہی ابتدائی خاندان کے مشتقات قرار دینا آج قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام مختلف اور جدا جدا نسلوں کے قسم قسم کی خصوصیتیں رکھنے والے افراد میں ایک ہی فطرتِ انسانی کام کر رہی ہے تو پھر یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مختلف خاندانِ السنہ ایک ہی ابتدائی زبان یا ایک ہی ابتدائی قبیلہ کی بولی سے نکلی

ہو گئی ہیں۔

زبان کی یہ خصوصیت نہایت ہی اہم ہے کہ وہ صرف انسان ہی کو حاصل ہے، اور جاہل سے جاہل بلکہ وحشی سے وحشی قبیلوں کے انسان بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال صرف یہ ہے کہ آیا ہم نے اسی طرح گفتگو کرنا شروع کر دیا جس طرح سانس لینے لگے تھے یا جیساکہ ہمارے جسم میں خون دورہ کرنے لگا تھا، یا اس طرح جیسے کہ ہم حرکت کرتے یا کھاتے پیتے یا اپنے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے کپڑوں کا استعمال کرتے ہیں۔

پہلی قسم کے طریقۂ کار میں ہماری مرضی اور ارادے کو دخل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف دوسری قسم کے کام انسانی طبعی قوتوں کے بالارادہ استعمال کا نتیجہ ہیں، جن میں ہم خدائے تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی قابلیتوں کے ذریعہ اور مدد سے اپنی فطری ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

ماہرین السنہ کا زیادہ تر رجحان اسی آخری طریقۂ کار کی طرف ہے، کیونکہ زبانیں آج اتنی مختلف نہ ہوتیں اگر بولنے والے اپنی جدا جدا ضرورتوں اور اہلیتوں کے مطابق خود ان میں ترقی اور تغیر و تبدل نہ کرتے۔ اس کے علاوہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس طرح غیر ارادی طور پر سانس لینے لگتا ہے، اسی طرح گفتگو نہیں شروع کرتا، اگرچہ اس میں پہلے ہی سے پروردگار نے گفتگو کرنے کی قابلیت پیدا کر دی ہوتی ہے۔

غرض انسان میں زبان سے کام لینے کی استعداد اس کی خاص فطرت کی طرح یقیناً ایک ودیعتِ الٰہی یعنی قدرت کی عنایت ہے۔ مگر زبان اس حد تک انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ اس خداداد قابلیت کو اپنی فطرت اور عضوی خصوصیت کی مدد سے ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا زبانوں کی تشکیل اور ارتقا براہ راست انسانی خیالات کی تشکیل اور ارتقا پر منحصر ہے۔ جیسے جیسے انسان کے خیالات ترقی کرتے گئے ایسے ایسے زبانیں بھی ترقی کرتی گئیں۔

زبانوں کے صوتی تغیرات: زمان و مکان کے حالات کے مطابق زبان خود بخود بدلتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کو ماہرین لسانیات زبان کا فطری ارتقا قرار دیتے ہیں۔ اس ارتقا کا انحصار زیادہ تر صوتی تشکیل اور تغیّر و تبدل پر ہوتا ہے۔

تاریخ السنہ میں صوتی تبدیلیوں اور ارتقا کو اس لیے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ زبان کی دوسری اکثر تبدیلیاں اور ارتقا کم و بیش اسی کے تحت ہوتے ہیں۔ صوتی تبدیلیوں کی سب پہلی اور اہم وجہ عضویاتی ہے۔ ایک نسل دوسری نسل کے لیے جو لسانی ورثہ چھوڑ جاتی ہے وہ بعینہٖ ایک اور معین نہیں ہوتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر نسل کے بعد اس کی آوازیں اور اس کے عضوی عادات و اطوار غیر محسوس طور پر کچھ نہ کچھ تبدیلی پاتے ہیں یہ تبدیلی اکثر ہمسایہ زبان کے اثر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بعض وقعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی ایک نسل کو ایک اجنبی زبان بولنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اُس اجنبی زبان کی آوازیں اس نسل کے اپنے لفظوں پر جو عمل یا ردِ عمل کرتی رہتی ہیں ان کے نتیجہ کے طور پر اس تمام نسل کے تلفظ آہستہ آہستہ اپنی جگہوں سے ہٹنے لگتے ہیں۔

مذکورہ بالا صوتی تغیر کی مثالیں اردو زبان میں بھی ملتی ہیں۔ جیسے آپ صرف اردو حرف جر "سے" لے لیجئے اور دیکھئے کہ زمانہ اور نسلوں کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال نے بھی کیا تغیر حاصل کئے ہیں۔ لفظ "سے" کی موجودہ شکل اُردو زبان میں صرف ڈیڑھ پونے دوسو سال ہی سے مستعمل ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ "سیں" یا "سوں" کی شکل میں رائج تھا۔ چنانچہ وؔلی دکنی یا اس کے ہم عصروں کے کلام میں آپ کو ہمیشہ "سیں" یا "سوں" نظر آئے گا۔ وؔلی کا شعر ہے ؎

مت غصہ کے شعلوں "سوں" جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی "سوں" یہ آگ بجھاتی جا

وؔلی سے تقریباً پچاس برس قبل یہ لفظ "ستے" اور "ستیں" کی شکل میں رائج تھا۔

چنانچہ قطب شاہی سلطنت کے عہد آخر کے شاعروں کا کلام اس کا شاہد ہے۔ ابوالحسن تاناشاہ اور اورنگ زیب کے ہم عصر غلام علی کی نظم "پدماوت" کا ایک مصرع ہے ع

بھلائی "ستے" تو بھلا پائے گا

غلام علی سے پچاس برس پیشتر اِس لفظ میں "س" کی آواز موجود نہیں تھی۔ اُس زمانے کے گولکنڈہ کے بسنے والے "مجھ سے کہا" کی جگہ "مجھ تھے کہیا" کہتے تھے۔ چنانچہ مشہور قطب شاہی بادشاہ محمد قلی اور اس کے درباری شعرا کے کلام میں لفظ "تھے" بمعنی "سے" ہی نظر سے گذرتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں ع

(۱) معانی کے باتاں "تھے" جھڑتا نمک

(۲) مرا گلستان تازہ اس "تھے" ہوا ہے

محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے غالباً گولکنڈہ کی تعمیر کے وقت بھی یہ لفظ "تے" کی شکل میں رائج تھا۔ وجہی جس نے ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے شاعری میں شہرت حاصل کی تھی، اکثر "تے" لکھتا ہے۔ مثلاً اس کا ایک مصرع ہے ع

سچ "تے" بچھڑ جلتی ہوں ہیں کیا سخت ہے دل اے پیا

وجہی سے پہلے تمام اردو تحریروں میں بھی "تے" ہی ملتا ہے۔ چنانچہ بندہ نواز گیسو دراز سے جو اُردو نثر منسوب ہے اُس میں بھی "تے" ہی لکھا گیا ہے۔ مثلاً "معراج العاشقین" کا ایک جملہ ہے:

اگر اس میں "تے" یک پردہ اُٹھ جائے تو اُس کی آنچ "تے" میں جلوں۔

اس وقت جس کتاب کو اردو زبان کی قدیم ترین نظم سمجھا جاتا ہے وہ میاں خوب محمد گجراتی کی "خوب ترنگ" ہے۔ اس میں اس حرف جر (جار) کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے، مگر چند مقامات پر حرف "تھیں" بمعنی "سے" استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

غیرت "تھیں،، سب کیا تبول

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ لفظ "سے" کی صوتی شکل مختلف زمانوں اور مقامات پر بدلتی گئی اور جو لفظ دراصل پہلے "تھیں"، یا "تے" تھا وہ "تھے"، "سے" "ستیں"، "سوں" اور "سیں"، ہوتا ہوا آخرکار "سے" بن گیا اور ابھی نہ معلوم آگے چل کر اس میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ نئی نسل انسانی اپنے آباؤ اجداد کے کسی خاص تلفظ کو ادا کرنے سے قاصر بھی ہو جاتی ہے۔ دُنیا کی متعدد زبانوں میں اس امر کے ثبوت موجود ہیں کہ زمانہ سلف میں کسی حرف کا ایک خاص تلفظ تھا۔ جب بعد میں چل کر وہ آواز ہی غائب ہو گئی تو اس حرف کے تلفظ کے لئے زبان کی موجودہ آوازوں میں سے کوئی آواز کام دینے لگی۔

ادغامی اثرات: اکثر دفعہ یہ ہوتا ہے کہ کسی حرف کا تلفظ پورا نہ سُننے کی وجہ سے وہ بولتے وقت غلط ادا کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے تلفظ کا اثر بالعموم کمزور آوازوں اور خاص کر حروفِ علت پر پڑتا ہے، جو یا تو اسی حالت میں باقی نہیں رہتے یا لفظوں میں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اُردو الفاظ لالٹین (لانٹرن) فلالین (فلانل) اور لمبر (نمبر) کی تشکیل اسی اثر کے تحت عمل میں آئی ہے۔

صوتی ارتقا اور تبدیلیاں نہایت باضابطہ ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات زبانوں کے متعلق متعدد اٹل قوانینِ قواعد بنا سکے۔ مثلاً آج آریائی لسانیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ سنسکرت کا ابتدائی حرف "و" اُردو، بہاری، بنگالی اور اُڑیا زبانوں میں بالعموم "ب" کی شکل میں منتقل ہو گیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اُردو کے اکثر الفاظ کا ابتدائی حرف "ب" پہلے "و" تھا مگر صوتی ارتقا و تبدیلی کے تحت آج "ب" بن گیا۔ اس قسم کے چند اُردو الفاظ کے اصل سنسکرت الفاظ کی مثال یہ ہے:

اُردو	سنسکرت	اُردو	سنسکرت
باٹ	وَرتم	بیس	ویمشتی
بن	وَنم	بیت	ویتر
بڑھ	وَٹ	بالو	والوک

اُردو زبان میں متعدد الفاظ ایسے موجود ہیں جن کی دو دفعہ کوزی آوازیں آتی ہیں، ایک ابتدا میں اور ایک لفظ کے درمیان میں۔ مثلاً

ٹاٹ، ٹکڑا، ٹوٹنا، ٹھنڈا، ڈانٹ وغیرہ

مگر انھیں اور اس قسم کے اور لفظوں میں اصل زبان میں پہلے کوزی آواز نہیں تھی، بلکہ دندانی تھی۔ چنانچہ یہ اصل خصوصیت دکنی اُردو میں اب تک موجود ہے۔ دکنی میں انھیں لفظوں کو

تاٹ، تکڑا، توٹنا، تھنڈا، داںٹ

کہتے ہیں اور اس سرزمین میں یہ خصوصیت اس شدت سے باقی ہے کہ اگر اب بھی کسی اجنبی زبان سے کوئی نیا لفظ ایسا مل جاتا ہے جس میں ابتدائی حرف کوزی ہو تو دکنی اُردو میں اس کی ابتدائی آواز دندانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ ٹکٹ کو دکنی عوام تکٹ کہتے ہیں۔

صوتی تبدیلیوں کی قسمیں: صوتی تغیر و تبدل سے متعلق ایک اور خاصیت بھی ہے جو زبان کے ارتقا میں کسی نہ کسی طرح عمل کرتی رہتی ہے۔ ہر زبان میں آپ کو ایسے لفظ ملیں گے جن کے تلفظ میں نہایت سرعت کے ساتھ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ان غیر طبعی تبدیلی حاصل کرنے والے الفاظ میں اکثر وہ ہوتے ہیں جو کسی کو مخاطب کرنے کے لیے یا آداب و روایاتِ معاشرت یا روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے کثرت سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً انگریزی "سٹیشن"، عوام کی زبان میں پہلے "اسٹیشن"، ہوا، اور پھر ابتدائی "ا" اور "س"، اُڑا کر "ٹیشن" رہ گیا،

اور اب تو بعض جگہ لفظ "ٹھیسن" بھی سُنا جاتا ہے۔

اسی قسم کی اور صوتی تبدیلیاں بھی ہیں جن میں اگرچہ لفظ کے معنی اور ایک حد تک شکل بھی قریب قریب وہی رہتی ہے، مگر یہ تبدیلیاں نہ تو کسی با ضابطہ صوتی اصول کے تحت عمل میں آتی ہیں اور نہ زبان کے اس قسم کے جملہ الفاظ پہ حاوی ہوتی ہیں۔

اس قبیل کی ایک تبدیلی یہ ہے کہ قریب المخرج حروف صحیح ایک دوسرے کی شکل میں منتقل ہو جاتے ہیں جیسے غالب نے ممبر کو لمبر لکھ دیا۔ اسی طرح لفظ بیرسٹر کا تلفظ بیلسٹر بھی کیا جاتا ہے یا کاغذ کو قاغذ کہتے ہیں، سرشار کو شرشار، شمس الدین کو شمش الدین اور رسٹیشن کو شٹیشن کہنا بھی اسی صوتی طریقۂ عمل کا نتیجہ ہے اور یہ تبادلہ ہمیشہ قریب المخرج حروف کے درمیان عمل میں آتا ہے۔ حروف "ر" اور "س" کے تلفظ کے لیے تالو پہ زبان جن حصّوں کو مَس کرتی ہے وہی حصّے "ل" اور "ش" کی آوازوں کے اظہار کے لیے آلودہ ہوتے ہیں۔

ایک صوتی تبدیلی اس طرح کی بھی ہوتی ہے کہ بعض لفظوں میں آوازیں اپنی ترتیب بدل دیتی ہیں۔ اس قسم میں وہ الفاظ شامل ہیں جو کہ اگرچہ اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتے، مگر ان میں کوئی نئی آواز یا حرف بھی داخل نہیں ہوتا مثلاً لفظ "رجحان" کا تلفظ "رحجان"، "فصیل" کا "صفیل"، "مطلب" کا "مطبل"، "کیچڑ" کا "چیکڑ" کہا جاتا ہے۔ ان تبدیل شدہ شکلوں میں آپ کو نیا حرف ایک بھی نظر نہیں آئے گا۔ حروف وہی ہیں، مگر ان کی ترتیب وہ نہیں ہے۔

مگر ان تبدیلیوں میں اور ارتقائے زبان کی باضابطہ اور غیر محسوس تبدیلیوں میں فرق ہے۔ ان مذکورہ بالا مثالوں کو ہم کسی اصول وقاعدہ کے تحت نہیں لا سکتے۔ یہ محض اتفاقی اور ہنگامی واقعہ کا نتیجہ ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اگر آپ اُردو الفاظ "کوڑی" اور "مچھلی" پہ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سنسکرت الفاظ "کپرو" اور "متسیہ" سے مشتق ہیں، یعنی لفظ کوڑی کے حروف "ڑ"

اور "و" آج "کپڑد" کے حروف "ر" اور "پ" کے قائم مقام ہیں۔
ان کا لسانیاتی ارتقا یوں ہوا:
"کپڑد"، "کپڈ"، "کوڈ"، "کوڑا" اور "کوڑی"۔[1]

دُنیا کی زبانیں

طریقۂ تقسیم: دُنیا میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کی گروہ بندی دو طرح سے عمل میں آتی ہے۔ پہلی قسم میں زبانوں کو لفظی اور صرفی خصوصیات کے لحاظ سے صرف دو بڑی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کی گروہ بندی نسلی اور تاریخی تعلقات کی بنا پر عمل میں آتی ہے اور اس میں متعدد جماعتیں ہیں۔

پہلی قسم میں دو جماعتیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں پہلی جماعت ان زبانوں کی ہے جو یک لفظی ہیں اور جن کے بنیادی الفاظ شکلی تبدیلیوں کے ذریعہ سے اپنے مفہوم میں تغیر و تبدل اور اضافے نہیں کرتے۔ اس قسم کی زبانیں چین، پاک و ہند کے مشرقی ممالک اور آبادیوں میں رائج ہیں۔ ان زبانوں میں تمام الفاظ بالعموم آزاد ہوتے ہیں اور ان میں سابقوں اور لاحقوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔

اس تقسیم کی دوسری جماعت میں دُنیا کی جملہ باقی ماندہ زبانیں شامل ہیں۔ ان میں الفاظ اپنی شکلیں اور ان کے ساتھ ان کے مفہوم بدلتے رہتے ہیں، اور ساتھ ہی سابقوں اور لاحقوں کے ذریعہ سے بھی ان کے معانی میں قسم قسم کے معنوی پہلو پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ہی لفظ اصل یا مصدر رہتا اور اسی سے سینکڑوں لفظ مشتق ہوتے ہیں۔

تاریخی اور نسلی تعلقات کے لحاظ سے دُنیا کی زبانوں کو آٹھ بڑے بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں کا ہر خاندان واضح کرتا ہے کہ اس کے بولنے والے خاص

---

[1] ہندوستانی لسانیات از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

خاص ممالک یا قبیلوں کے افراد ہیں، جن میں سے بعض اس وقت ایک دوسرے سے جدا بھی ہو گئے ہیں لیکن ان کی زبان میں وہی قدیم اشتراک باقی ہے۔

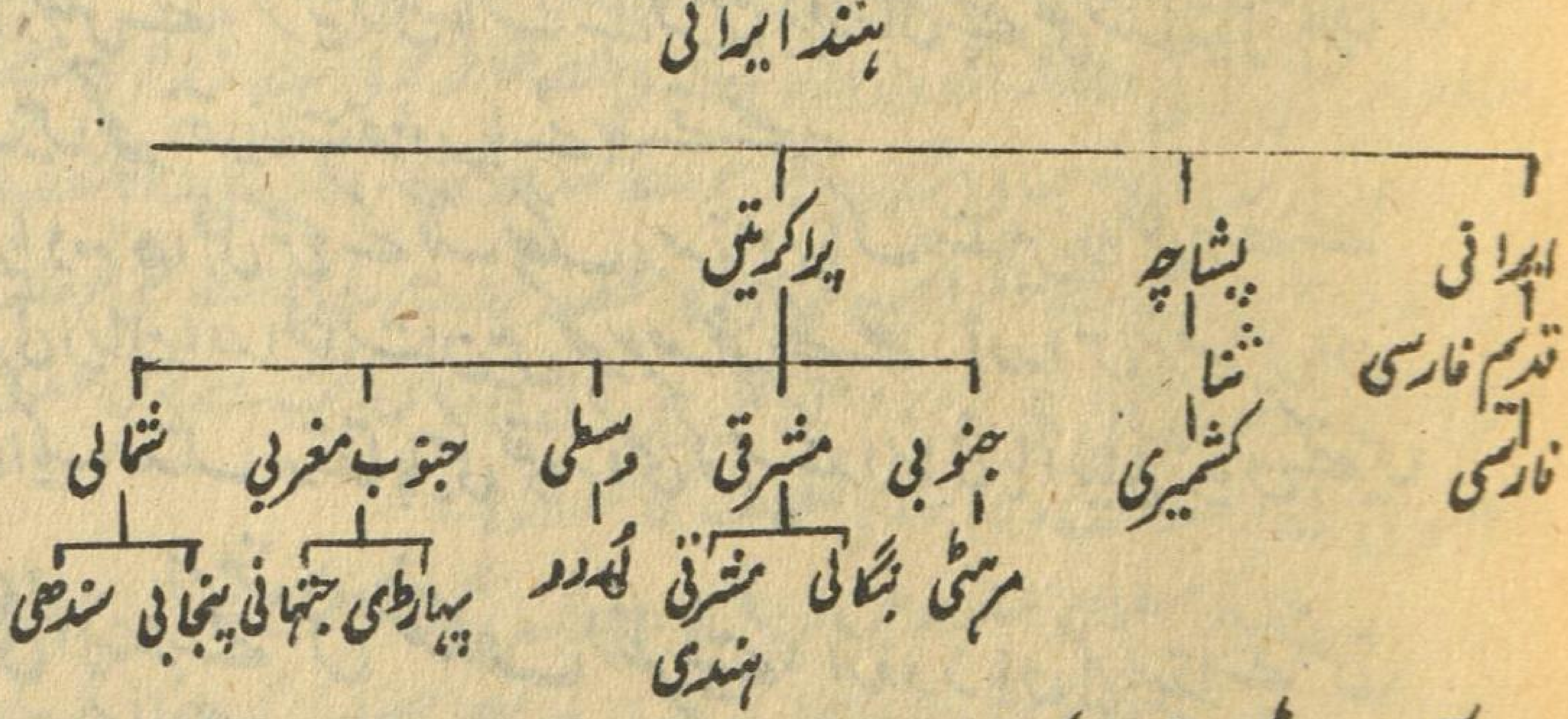
مختلف خاندانِ السنہ: دُنیا کے آٹھ بڑے بڑے خاندانِ السنہ یہ ہیں:

(۱) سامی (۲) ہند چینی (۳) دراوڑی (۴) مونڈا (۵) افریقہ کی بانٹو
(۶) امریکی (۷) ملایا (۸) ہند یورپی۔

ہمارے زیرِ بحث موضوع کا تعلق صرف ہند یورپی گروہ سے ہے۔ ہند یورپی خاندان کی زندہ زبانوں کو آٹھ شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(۱) ہند ایرانی یا آریائی (۲) ارمنی (۳) بلقان سلافی (۴) البانوی (۵) ہیلینی
(۶) اطالوی (۷) کیلٹک (۸) ٹیوٹانی۔

ہند ایرانی یا آریائی خاندان ہی سے ہماری زبان اُردو کا تعلق ہے۔ درج ذیل دیئے گئے نقشے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہند آریائی، ہند ایرانی کی شاخ ہے اور اُردو ہند آریائی کی:



ہند آریائی زبانوں کے دور:

سرزمین پاک و ہند کی ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کو لسانی اور صوتی مدارج ارتقا کے لحاظ سے تین وسیع دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) قدیم ہند آریائی ۔ اسے ویدی یا سنسکرتی دور بھی کہہ سکتے ہیں۔
(۲) درمیانی ہند آریائی ۔ اسے پراکرتوں کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔
(۳) جدید ہند آریائی ۔ اسے اپ بھرنشوں کا دور بھی کہتے ہیں۔ پاک و ہند کی کی موجودہ زبانیں اسی دور یعنی اپ بھرنشوں سے وجود میں آئی ہیں۔

آریوں کی سرزمین پاک و ہند میں آمد: آریائی زبان سرزمین پاک ہند میں ایک تنہا اور معین معیاری زبان کی شکل میں نہیں داخل ہوئی بلکہ ان متعدد بولیوں کے ایک گروہ کی حیثیت سے جو منتشر آریا قبیلوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں ان میں سے صرف ایک ابتدائی بولی ویدوں کی زبان ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی۔ مگر اس عہد میں یقیناً دوسری بولیاں بھی رائج تھیں، جو طویل زمانوں میں تغیر و تبدل حاصل کر کے آج جدید ہند آریائی زبانوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اُن قدیم ہند آریائی بولیوں میں جو باہمی اختلاف و اتحاد تھا اس کی نسبت اس وقت زیادہ مواد موجود نہیں ہے، مگر یہ گمان غالب ہے کہ تین ہزار سال پہلے بھی ہند آریائی زبانوں کے آپس میں کچھ اختلافات ضرور پائے جاتے تھے۔

آریا (۱۵۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ)، سرزمین پاک و ہند میں داخل ہونے سے پہلے مشرقی ایران اور افغانستان میں کچھ عرصہ ٹھہر چکے تھے۔ اور اس عرصہ میں ان کی زبان ایک حد تک ارتقا پا چکی تھی۔ اسی کو ہم ہند ایرانی یا آریائی زبان کہتے ہیں۔

اُردو کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریے: اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق جو نظریے پیش کیے گئے ہیں ان میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مگر ان اختلافات کے باوجود اتنا ضرور ہے کہ ان سب رایوں میں اردو زبان کے آغاز کو ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے، مگر اس میل جول کے مقام، نوعیت اور پھر نتیجے نکالے ہیں یہ سب آراء ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اس طرح

اُردو کے آغاز کے متعلق جُدا جدا نظریے پیش کیے ہیں۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ اُردو کا آغاز دکن میں ہوا۔

ساتویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانہ میں عرب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت تجارتی اغراض سے سمندر پار کر کے ہندوستان پہنچی اور ساحل مالابار پر توطن اختیار کیا۔ صوبہ مدراس کے بہت سے مسلمان خاندان اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ انھیں عرب تاجروں کی اولاد ہیں۔

۱۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ اسی ہندو مسلمان میل جول کی وجہ سے زبان بن گئی تھی جو موجودہ اُردو کی ماں تھی، اور جس میں ایک ہزار ایک سو عیسوی سے قبل کتابیں بھی لکھی جا چکی تھیں۔ مگر یہ خیال کچھ قابلِ لحاظ نہیں ہے کیونکہ اردو ایک آریائی زبان ہے اور ان قدیم عرب مہاجرین میں سے اکثر نے ایک ایسی سرزمین کو اپنا وطن بنایا جہاں دراوڑی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان میں سے بعضوں نے مہاراشٹر میں قیام کیا تو اس قسم کے میل جول کا نتیجہ ایک ایسی زبان ہوتی جو محض عربی اور مہاراشٹری عناصر پر مبنی ہوتی حالانکہ اُردو زیادہ تر فارسی سے متاثر ہوئی ہے نہ کہ عربی سے۔

۲۔ دوسرا مقام جہاں مُسلمان مقیم ہوئے سندھ تھا۔ وہاں بھی وہ سمندر کے راستہ داخل ہوئے تھے۔ مگر اس دفعہ ان کا مقصد تجارت کے بجائے ملکی فتوحات تھا۔ سندھ کی مکمل فتح ۷۱۱ء میں عمل میں آئی اور اس وقت سے نویں صدی عیسوی کے وسط تک وہ اسلامی حکومت کا حصہ رہا۔

یہ واقعہ کہ مسلمان سندھ میں قریباً چار صدیوں تک حکمرانوں کے طور پر وہاں کے لوگوں سے مل جل کر نشو و نما حاصل کرتے رہے بعض حضرات کو یہ خیال کرنے کی طرف مائل کرتا رہا کہ وہاں (سندھ میں) انھوں نے فطرتاً ایک زبان کی بنیاد رکھی ہوگی، جو اردو کی ابتدائی شکل تھی۔ مگر یہ خیال بھی انھیں وجوہ کی بنا پر قابلِ قبول نہیں ہے جو ساحل مالابار والے دبستان خیال کی مخالفت میں پیش کیے گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ میں ایک زبان یقیناً ارتقاء پاتی رہی، مگر وہ اردو نہ تھی بلکہ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں نمبر سے مقام پر یعنی پنجاب میں آمد فارسی بولنے والے افراد یعنی سلطان محمود غزنوی اور اس کے لشکر کے ہاتھوں عمل میں آئی جنھوں نے پنجاب پر حملہ کیا اور آخر کار دسویں صدی عیسوی کے آخر میں اس پر قابض ہو گئے۔ غزنویوں کے تحت پنجاب ۱۱۹۳ء تک ایک آزاد حکومت رہا اور اس کا دارالحکومت لاہور تھا۔ ۱۱۹۳ء میں جب محمد غوری نے دہلی فتح کی تو پنجاب اس کی حکومت کا ایک صوبہ بن گیا۔

غزنویوں نے پنجاب پر قریباً دوسو سال تک حکومت کی تھی اور اس قیام اور یہاں کے لوگوں سے ہر سطح پر میل جول کے نتیجہ میں ایک زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں یہی ثابت کیا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب میں ہوا تھا، مگر اس خیال کو بھی پوری طرح درست نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ محمود شیرانی کا حاصل کردہ تحقیقی مواد اردو کی تحقیق و آغاز سے متعلق مفید نتیجوں پر پہنچنے کے لیے کافی ممد و معاون ہو سکتا ہے۔

۴۔ زبانِ اردو کا آغاز عام مستند رائے کے مطابق اس وقت سے ہوتا ہے جب محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کی سلطنت فتح کی اور اس کے بعد اس حصہ ملک پر ایک طویل عرصہ تک مسلمان خاندان حکمران رہے۔ متعدد مصنفوں کی یہ رائے ہے کہ اردو فارسی اور ہندی کے میل جول کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ نیز یہ کہ وہ عام طور پر محمد تغلق (عہدِ حکومت ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) کے زمانہ میں بولی جاتی تھی۔ اور اسی کی فوجیں اس زبان کو دکن لے گئیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس (اردو) کا تعلق ان زبانوں سے ہے جو دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں۔ یہ رائے بھی کلیتاً صحیح نہیں۔

اردو کا سنگِ بنیاد در اصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا

چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اُس وقت ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت نہ بنا لیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم "نئے ہند آریائی دور" میں اس حصہ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ (اردو) اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگا جمنا میں بولی جاتی تھی، کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ ان کی اس وقت کے اختلافات ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔

موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔ یقین ہے یہ فرق مسلمانوں کے دہلی پر قبضہ کے بعد شروع ہوا ہے۔ ابتدا میں وہ صرف ایک تدریجی تغیر ہوگا، مگر آخرکار ان دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہوتی گئی کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے، بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جو اِن دونوں (پنجابی اور کھڑی) کی مشترک سرچشمہ تھی، اور یہی وجہ ہے کہ وہ (اردو) بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی بولی سے۔ لیکن کیونکہ مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں، اس لئے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔

یہاں ایک یہ بات بھی مدِ نظر رکھنی چاہیئے کہ اردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف اس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی جاتے

ہوئے راستہ میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اس علاقہ کے لوگ بھی دہلی اور اس کے گرد و نواح میں جاکر آباد ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح اور مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آرہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہوتا گیا۔

ہمارے اس نظریے کا ثبوت اردو کی دکنی شاخ پر غور و خوض کرنے پر بھی حاصل ہوتا ہے۔ جب شمال کے مسلمانوں نے دکن پر حملہ کیا تو وہاں ان کے ساتھ وہی زبان گئی جو ابھی خام تھی اور جس پر نواح دہلی کی زبان کا پورا اثر نہیں پڑنے پایا تھا۔ یہ غیر پختہ زبان دکن میں پھیل گئی اور بالکل نئے اصولوں پر نشو و نما پانے لگی۔ وہ ان اثرات سے محروم رہی جو شمالی ہند میں اردو کی تشکیل کر رہے تھے اور جن کی وجہ سے وہاں (نواح دہلی میں) اردو رفتہ رفتہ کھڑی بولی سے قریب ہوتی جارہی تھی۔

ارتقائے اردو کے تین مرکز: اردو زبان کا ارتقا پنجاب ہی سے شروع ہو چکا تھا، لیکن اس کے ثانوی مدارج دوآبہ گجرات (بھارت) اور دکن میں تکمیل کو پہنچے۔ دہلی میں یہ زبان ڈیڑھ سو برس تک رہنے کے بعد مسلمانوں کی فوجوں کے ہمراہ گجرات اور دکن کا رخ کرتی ہے۔ اس عرصہ میں ہریانوی اور ایک حد تک برج بھاشا اور اس کی عام بول چال کی شکل کھڑی بولی کے اثرات اس (اردو) پر کارگر ہو چکے تھے، مگر وہ موخر الذکر سے پوری طرح متاثر نہ ہونے پائی تھی۔ جب یہ گجرات اور دکن میں پھیلنے لگی تو شمال اور دکن و گجرات سیاسی اسباب کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے اور ان کی اس سیاسی جدائی نے اردو زبان کو خاص طور پر متاثر کیا۔ یعنی اس طرح اردو تین جدا جدا شاخوں (شمال، دکن، گجرات) میں بٹ گئی اور یہ تینوں شاخیں صدیوں تک نہ صرف آزاد اور علیحدہ رہیں بلکہ انھوں نے لسانی لحاظ سے مختلف ارتقا کیے۔

جب اردو کی دکنی شاخ دکن میں کھڑی بولی کے اثر سے بچ رہی تھی تو اس کا لازمی نتیجہ تھا وہ شمالی (دہلی کے نواح کی) اردو سے جدا ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ دکنی اُردو نے اس طرح بہت سی وہ خصوصیتیں محفوظ رکھ لیں جو آج پنجابی زبان سے مشابہ ہیں۔ دراصل یہی وہ راز ہے جو شمالی (دہلی اور اس کے گرد و نواح) اور جنوب (دکن) کی اردو میں آج تک اختلاف کا باعث ہے۔

شمالی ہند کے مقابلہ میں دکن میں اُردو اس لیے جلد ارتقا پا گئی اور تصنیف و تالیف کے لیے استعمال ہونے لگی تھی کہ:

۱۔ جو لوگ سلطان علاؤ الدین خلجی اور اس کے مشہور سپہ سالار ملک کافور کے ہمراہ ۱۳۱۴ء میں اور خاص کر محمد تغلق کے ساتھ ۱۳۲۸ء میں دکن پہنچے ان کی زبان بالکل ابتدائی اور غیر معین یا اثر پذیر حالت میں (ابتدائی اُردو) تھی چنانچہ یہی غیر معین اُردو دکن کے ان مسلمانوں میں اشاعت پائی جو یا تو وہیں کے اصلی باشندے تھے یا ایرانی اور عربی مہاجرین کی اولاد سے تھے۔ مگر جب بہمنی سلطنت کے قیام ۱۳۴۷ء کے بعد دکن اور شمال سیاسی لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو ان دونوں مقامات کی زبان کے اتحاد کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ اس پر ان جگہوں کے غیر مسلم ہمسایوں نے بھی کافی حصہ لیا۔ شمال (دوآبہ گنگا جمنا جو ہندو مسلم اتصال کا سب سے بڑا مرکز ہے) میں ہندوؤں کی صرف ایک ہی بولی تھی مگر دکن میں مختلف زبانیں مستعمل تھیں۔ جن میں کوئی آریائی تھی تو کوئی دراوڑی۔

پس جہاں اردو شمال میں ایک خاص زبان سے مالا مال ہو رہی تھی، دکن میں اپنی مختلف ہمسایہ زبانوں سے کسی طرح مستفید نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ شمال کی زبان ماخذ کے لحاظ سے اُردو کے قریب تھی، اس کے برخلاف دکن کی زبانیں ایک تو متعدد تھیں اور دوسرے لسانی حیثیت سے آپس میں مختلف اور اُردو سے بہت دور تھیں۔

۲۔ فارسی اور ترکی بولنے والے ممالک سے دکن بہت دور تھا۔ اس کے علاوہ ان سے دکن کا کوئی سیاسی تعلق بھی نہ تھا۔ اس کے برخلاف شمال پر ہمیشہ ان غیر ہندوستانیوں

کے حملے ہوتے رہے۔ قطب الدین ایبک (عہدِ حکومت ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء) سے بہادر شاہ ظفر (عہدِ حکومت ۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) تک قریب قریب ہر حکمران خاندان غیر ہندستانی تھا اور ان کی زبان رعایا کی زبان سے مختلف تھی۔

دکن کی سلطنتوں کے بانی شمالی حکمران سلسلوں کے بانیوں کی طرح نو وارد ترکی یا ایرانی نہیں تھے بلکہ دکنی سلطنتوں کے بانی وہی تھے جو دکن یا ہندوستان میں ایک مدت سے مقیم تھے اور ہندوستانی زبان اور معاشرے سے مانوس تھے۔

بہمنی سلطنت کے زوال پر جب دکن میں جدا جدا حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے بانی بھی اکثر وہی تھے جو بہمنی دربار میں بچپن سے پرورش پا چکے تھے اور جن کا دکنی اردو سے ناواقف رہنا محال تھا۔ سلطنت احمد نگر کا بانی تو ایک نو مسلم تھا اور کنڑی اور دکنی اردو کا اچھا ماہر تھا۔

۳۔ حکمران سلسلوں کے بانیوں کے علاوہ شمال کے بالعموم تمام بادشاہوں کی زبان فارسی یا ترکی اور بیرونی زبان تھی۔ محمد تغلق سے محمد شاہ تک دہلی کے کسی بادشاہ نے ہندوستانی (اردو) میں نہ نثر لکھی اور نہ نظم۔ اس کے خلاف دکن میں کئی بادشاہ مثلاً قطب شاہیوں میں محمد قلی، محمد عبداللہ اور ابوالحسن اور عادل شاہیوں میں ابراہیم ثانی، علی ثانی اور سکندر ایسے گزرے ہیں جن میں سے اکثروں کی ہندوستانی (دکنی اردو) نظم و نثر اس وقت بھی موجود ہے۔

بادشاہوں کے علاوہ شمالی سلطنتوں کے امراء اور فضلا نے بھی اردو زبان کے ارتقا میں بہت کم حصہ لیا۔ ان پر ہمیشہ فارسی اثر غالب رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کبھی ترکستان، ایران یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا، یا تباہی آتی تو وہاں کے باشندے پناہ لینے کے لیے یا تلاشِ معاش میں ہندوستان ہی کا رخ کرتے۔ چنانچہ آئے دن ان کی ٹولیاں ہندوستان میں داخل ہوتی رہتی تھیں اور وہ پھر یہیں رہ جاتے۔

۴۔ شمال مغرب کی جانب سے حملے بھی ہوا کرتے تھے، جن کا سلسلہ احمد شاہ درانی کے پانچویں حملے (۱۷۶۱ء) تک برابر جاری رہا۔ یہ تمام حملہ آور غیر اردو زبانیں بولتے تھے

السنہ کی سیاسی مداخلتوں کے سوا علمی و ادبی فضا میں بھی ہر وقت ایرانی اثر غالب رہتا تھا۔ شاہی درباروں سے محمد شاہ کے زمانے تک بالعموم ٹھیٹ ایرانی شاعر اور عالم گراں بہا صلے حاصل کرتے رہتے تھے۔ فارسی شعراء کی قدر و منزلت میر اور سودا کے زمانے تک جاری رہی۔ فارسی گو امیروں اور عالموں کی اس آئے دن کی درآمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں فارسی دانی عام اور لازمی ہو گئی۔ اس طرح سے شمال کی ہندوستانی (اردو) ایک مستقل اور علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے کوئی ترقی نہ کر سکی، البتہ فارسی اور عربی کے الفاظ اس میں داخل ہوتے گئے۔

تاریخیں ثابت کرتی ہیں کہ دکن کے علماء زیادہ تر مقامی یا ملکی ہی ہوتے تھے۔ جو مقامی یا ملکی نہ ہوتے تھے وہ وہاں کے لوگوں کو سمجھنے کی خاطر وہاں کی زبان ہی میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

شمال میں ہندو اور مسلمان جہاں درباروں اور مجلسوں میں فارسی گوئی پر مجبور رہتے تھے بازاروں اور عام مقامات پر ہندوستانی (اردو) ہی بولتے تھے، جس کی وجہ سے روزمرہ کی زبان میں ارتقا ہوتا گیا۔ دکن میں اس قسم کے ارتقا کے لیے رکاوٹیں تھیں، کیونکہ ہندوستانی (دکنی اردو) باوجود کئی صدیوں کی علمی سرپرستی کے دکنی باشندوں کی مقامی بولیوں سے مختلف تھی۔ وہ اپنی دیسی بولیوں کو اس (دکنی اردو) میں یا اس کو اپنی بولیوں میں ضم نہ کر سکے جیسا کہ شمالی ہند کے عام باشندوں (ہندوؤں) نے کیا۔

مغلیہ سلطنت کے آخری زمانہ میں شمال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانیں (یعنی کھڑی بولی اور اردو) زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ گھل مل کر ایک ہو گئی تھیں لیکن جہاں دوآبہ (گنگا جمنا کا علاقہ) کے ہندوؤں نے ایک طرف مسلمانوں کی لائی زبان (فارسی) کو بالکل اپنا لیا، دوسری طرف اپنی ادبی زبان برج بھاشا کو ترک کر کے فارسی میں تصنیف و تالیف شروع کر دی۔ چنانچہ ان کی اس فارسی

تحصیل نے اُن کی روزمرہ کی زبان کو بہت متاثر کیا۔ اس کے برخلاف دکنی ہنود اگر فارسی تصنیف و تالیف کرنا چاہتے تو انھیں اُردو کے علاوہ ایک اور اجنبی زبان بھی سیکھنی پڑتی۔ خود اُردو یا ہندوستانی ان کے لیے ایک بیرونی اور اجنبی زبان تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دکنی اُردو کے لفظی خزانہ میں بیرونی یا فارسی عناصر کا اضافہ نہ ہوسکا۔ جو کچھ بیرونی عنصر ابتدا سے جزوِ زبان ہوگیا تھا وہی باقی رہا اور اس میں شکلوں کے لحاظ سے بہت کچھ تبدیلی ہوگئی تھی۔

اس وقت تک جو امور اُردو کی ان دونوں اہم شاخوں کے باہمی اختلاف کی نسبت پیش کیے گئے وہ اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ شمالی اُردو پر کھڑی بولی کا ایسا گہرا اثر پڑا کہ اس کی بہت سی ابتدائی یا اصلی خصوصیتیں مفقود ہوگئیں، اور جو کچھ باقی رہیں وہ مسخ شدہ حالت میں ہیں۔ اس کے برخلاف دکنی میں قدیم سے قدیم شکلیں اور خصوصیتیں بالکل محفوظ ہیں، جن کی بنا پر وہ جدید پنجابی کے مشابہ ہے۔

سید سلیمان ندوی کی رائے

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کے گھرانے زبان کے لحاظ سے سامی، تورانی اور آریائی یعنی تین مستقل خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اسلام کا بڑا کارنامہ سب کو ملانا اور جوڑنا ہے۔ عرب جہاں اور جس ملک میں بھی گئے ان کی زبان عربی نے یا تو آہستہ آہستہ وہاں کی زبان کی جگہ لے لی یا وہاں کی زبان کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ عرب و ہند[2] کا تعلق اسلام سے بہت پہلے سے اور نہایت پرانا ہے، خاص کر گجرات[3] اور اس کے اطراف کے علاقہ سے ہندوستان کی تمام مصنوعات اور پیداوار انھیں ساحلوں سے عرب کو اور عرب کی راہ سے یورپ تک پہنچتی تھی۔ اس بنا پر مسالے اور خوشبودار چیزوں اور کپڑوں کے سنسکرت اور ہندی نام قدیم عربی زبان میں داخل ہو گئے۔ مثلاً زنجبیل، فلفل، نیلوفر، مشک، صندل وغیرہ۔

مسلمانوں کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے، اور یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس حملہ کی ابتدا مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھا جیسا کہ

---

[1] نقوش سلیمانی از سید سلیمان ندوی

[2] ہند یا ہندوستان سے سرزمین پاک و بھارت مراد ہے

[3] بھارت کا ایک شہر۔

عموماً سمجھا جاتا ہے بلکہ ایرانیوں کی اعانت کے لیے ہندوستان کی آمادگی تھی اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کا حفظِ ماتقدم کے طور پر سندھ پر قبضہ تھا۔ اس کے تقریباً چار سو برس کے بعد ترک اور ایرانی فتوحات کا سیلاب درہ خیبر سے گذر کر ہمالیہ کے پانچ دریاؤں میں آکر مل گیا۔ یہ اُردو زبان کی تاریخ کا پہلا دن ہے۔

ہندوستان کسی زمانہ میں بھی ایک نہ تھا۔ یہاں کا ہر صوبہ ایک نئی راجدھانی ایک نئی زبان اور ایک نئے تمدن یعنی ایک نیا ملک تھا جو اپنے لیے مخصوص خصوصیات رکھتا تھا۔ سنسکرت زبان یہاں کی مشترک مقدس زبان ضرور نظر آتی ہے لیکن تاریخ سے ثابت نہیں کہ یہ کسی زمانہ میں تمام ملک کی مشترک گفتگو کی زبان تھی۔ ہندوستان کا میدان داخلی اقوام کے علاوہ خارجی حملہ آور قوموں کی بھی جولانگاہ رہا ہے سیتھین یعنی ایک تورانی النسل شاخ، پھر آریا، پھر یونانی، پھر عرب، ترک، پٹھان اور مغل اقوام یکے بعد دیگرے ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ سولھویں صدی میں یورپ کا یہاں کے سواحل پر گذر ہوا، جن میں سب سے پہلے پرتگالی، ان کے بعد فرانسیسی اور سب سے آخر میں انگریز آئے۔ ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اُردو ہے۔

اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کسی ایک قوم کی زبان نہیں ہے۔ اس میں ہندی، اسلامی اور یورپین تمام بانوں کا ذخیرہ ہے۔ اور اس لیے اس کی ملکیت کا باشندگان ہند (پاک و ہند) بجا طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں اور اس کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے، بلکہ ہندوستان (پاک و ہند) کی مشترک زبان ہے جس میں پنجابی، بنگالی مرہٹی، گجراتی بولنے والا بے تامل اپنا مطلب بیان کر سکتا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً تین سو بولیاں اور زبانیں ہیں جو پہاڑوں اور صحراؤں کے چھوٹے چھوٹے آوارہ گرد قبائل سے لے کر بڑی بڑی قوموں پر محیط ہیں۔

مسلمان عربی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے۔ انھیں ہندوستان میں آئے دو سو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان پیدا ہو گئی۔ اردو شاہجہان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہ زبان غوریوں خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانہ میں پیدا ہو چکی تھی۔

امیر خسرو نے جو ساتویں صدی ہجری کے آخر اور آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں تھے، اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیاں گنوائی ہیں:

سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوری (واقع بنگال)، گجراتی، تلنگی، معبری (کنڑی)، دھور سمندری (کارومنڈل)

اودھی اور دہلوی

امیر خسرو سے تین سو برس بعد اکبر کے زمانہ میں بھی یہی بولیاں تھیں۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں ان زبانوں کے یہ نام گنواتا ہے:

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شال (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے)، بلوچستانی، کشمیری۔

مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیراچند اوجھا نے "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" کے عنوان سے چند خطبے دیے ہیں۔ اس میں انھوں نے دوسری تقریر کے خاتمہ میں سنسکرت کے بعد یہاں کی پراکرت زبانوں کی یہ چھ قسمیں بتائی ہیں:

ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری، پیشاچی، اونتک، اپ بھرنش

ماگدھی

مگدھ اور اس کے قرب و جوار کے عوام کی زبان تھی۔ قدیم ماگدھی اشوک

کے کتبوں میں ملتی ہے۔ عام طور پر سنسکرت کے ناٹکوں کے چھوٹے ملازم اور بچوں سے اسی زبان میں باتیں کرائی جاتی تھیں۔

شور سینی

شور سینی یا متھرا کے علاقہ کی زبان تھی۔ سنسکرت ناٹکوں میں عورتوں اور مسخروں کی بات چیت میں اس کا استعمال اکثر کیا گیا ہے۔

مہاراشٹری

مہاراشٹری یعنی مرہٹہ کی زبان ہے۔ اس کا استعمال بالخصوص پراکرت زبان کی شاعرانہ تصانیف کے لئے کیا جاتا تھا۔

پیشاچی

پیشاچی زبان کشمیر اور ہندوستان کے مغربی اور شمالی حصوں کی زبان تھی۔

اونتک

اونتی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی۔ یہ زبان اجین اور مندسور میں رائج تھی۔

اپ بھرنش

اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ، جنوبی پنجاب، راجپوتانہ، اجین اور مندسور وغیرہ مقامات میں تھا۔ دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی، بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت زبانوں کی بگڑی ہوئی مخلوط زبان کا نام ہے۔ راجپوتانہ، مالوہ، کاٹھیاواڑ اور کچھ وغیرہ مقامات کے بھاٹوں کے گیت اسی زبان کی بگڑی ہوئی صورت میں ہیں۔ قدیم ہندی بھی بیشتر اسی زبان سے نکلی ہے۔

دیسی زبانوں میں مسلمانوں کے لفظوں کی آمیزش

مسلمان ہندوستان کے جس صوبہ میں گئے، وہاں کی زبان اختیار کر لی اور ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور علمی ضرورتوں کی بنا پر اپنی زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ وہاں کی زبان میں مجبوراً شامل کر دیئے۔

مذہبی مصطلحات اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، دعا، خیرات صدقات، رسول، پیغمبر، وحی، کتاب الٰہی، دوزخ، بہشت وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جو بعینہٖ ہندوستان کی ہر بولی میں مجبوراً اضافہ ہوئے

اسی طرح بادشاہ، وزیر، میر عدل، صدر جہاں، مقطع دار، صوبہ دار، سپہ سالار، قاضی وغیرہ الفاظ سلطنت کے روزمرہ میں جاری تھے۔ اسی طرح زمینداری میں جس قدر عہدے اور مالی اصطلاحات ہیں وہ عموماً عربی، فارسی آمیز ہیں۔ مثلاً دیوان، نائب، تحصیلدار، ضلعدار، کارندہ، گماشتہ تحویلدار، واصل، باقی نویس، خزانچی، منصدی، پیشکار، سررشتہ دار، محافظ دفتر، محرر وغیرہ۔ اب اصطلاحات کو لیجیے: واصل باقی، جمع بندی، مالگذاری، جمع خرچ، گوشوارہ، فرد، بند، روزنامہ، یادداشت، خلاصہ کیفیت، جنس وار، پروانہ وغیرہ۔ یہ الفاظ نہ صرف اردو اور ہندی میں بلکہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں بھی بعینہٖ یا ان کے دوسرے مترادف مستعمل ہیں۔

زراعت ہندوستان کا پیشہ تھا مگر مسلمانوں نے آکر اسے ایک فن کی حیثیت سے ترقی دی اور کابل، ترکستان اور ایران کے بیسیوں میوے اور پھل ہندوستان میں لائے اور اُن کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی آئے، اور یہ سارے ہندوستان میں ہر بولی بولنے والوں کی زبانوں پر بعینہٖ چڑھ گئے۔ انگور، انار، سیب، بہی، انجیر، نارنگی، خربزہ، تربزہ، بادام، منقی، کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، آبجوش، خوبانی، چلغوزہ، فندق وغیرہ وغیرہ۔

مسلمان پھولوں کی بھی کئی قسمیں ہندوستان لائے، مثلاً گلاب، سوسن، سنبل، ریحان، بنفشہ، خطمی، نرگس، نسرین، نسترن، گل طرہ، گل شبو، گل مخمل وغیرہ۔

آج یہ واقعہ تعجب سے سُنایا جائے گا کہ تغلقوں کے زمانے میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں بارہ سو باغ تھے جن میں نو قسم کے انگور تھے۔

کھانوں میں مسلمان ہندوستان میں خشکہ، پلاؤ، قبولی، بریانی، زردہ، شیر برنج، قورمہ، قلیہ، شوربا، کباب، یخنی، دم پخت، قیمہ، کوفتہ، مزعفر، مطنجن، حلوا، نان، شیرمال، آبی، باقرخانی، روغنی، چپاتی، کاک، کلچہ وغیرہ پینے میں شربت، فالودہ، برف وغیرہ لائے۔

کپڑوں اور لباس میں مخمل، قاقم، کاشانی، زربفت، طاس، منقیش، شروانی، شجر، کمخواب، دیبا، اطلس، تافتہ، بافتہ، مشروع، زری، گلبدن، تن زیب، شال باف، جامہ دار، محمودی، علی قلی خانی، زرتار، چارخانہ، جامدانی، کامدانی، کرتہ، اچکن، چکن، پیشواز، میرزائی، نیم آستین، جامہ، عبا، قبا، چوغا، فرغل، کلاہ، دستار، کلغی، شال، دوشالہ، چادر، پوستین، شلوار، پاجامہ، ازار، توشک، لحاف، فرش، قالین، مسند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، رومال، موزے، ازاربند، کمربند کے نام عربی، فارسی اور ترکی سے آئے۔

پان ہندوستان کی چیز تھی مگر اس کے لیے پاندان، خاصدان اور اگالدان اسلامی تہذیب نے پیش کیے۔ ہندوستانی (مراد ہے ہندو) مٹی کی ہانڈیوں میں کھانا پکاتے تھے اور کیلے وغیرہ کے پتوں پر رکھ کر کھانا کھاتے تھے۔ مسلمان آئے تو دیگ، دیگچی، کفگیر، چمچہ، رکابی، پیالہ، بادیہ، تاب، دسترخوان، آفتابہ، آبخورہ، سیلابچی، صابون، خلال، پکاول، باورچی، رکابدار، خانساماں اپنے ساتھ لائے۔

رات کو روشنی کے لیے ہندوستان میں دیا اور دیپک جلا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے انھیں روشنی کے لیے مشعل، فانوس، دیوار گیر، لالہ، مردنگ اور فتیلہ دیئے۔

ہندوستان ہمیشہ سے گرم ملک ہے، مگر شورہ لگا کر اور پہاڑوں سے برف منگوا کر گرمی میں پانی کو ٹھنڈا مسلمانوں نے کیا۔ اور چق، چلمن اور پردے لٹکا

کہ کمروں کو گرمی سے محفوظ کیا، اور ہندوستان ہی کی ایک گھاس کو "خس" کہہ کر پکارا اور اس کی ٹٹیاں بنوا کر کھڑی کیں۔

گھوڑے کی سواری کے سلسلہ میں لگام، زین، تنگ، خوگیر، رکاب، نعل، نکتہ، جل، سائیس، سوار، شہسوار، تازیانہ اور قمچی کے الفاظ مسلمان ساتھ لائے اور یہاں رائج کیے۔

جواہرات میں دُرِ عمانی، عقیق یمنی، لعلِ بدخشانی، زمرد، زبرجد، یشب، فیروزہ، سنگ ستارہ سب ان کے لائے ہوئے ہیں۔

تعمیری پتھروں میں سنگِ مرمر، سنگِ سرخ، سنگِ سماق، سنگِ لرزاں، سنگِ خارا سب ان کے نکالے ہوئے ہیں۔

زیوروں میں سرپیچ، مرزا بے پروا، کلغی، طرہ، درہ، گوشوارے، دست بند، جہانگیری، بازوبند، نورتن، جوشن، پری بند، ہیکل، طوق، تعویذ، گلوبند، زنجیر، کمرزیب اور پازیب ان بیسیوں ناموں کو چھوڑ کر ہیں جو مسلمانوں نے ہندی میں وضع کیے۔

خوشبوؤں میں عطر مسلمانوں کی ایجاد ہے۔

ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت ساز و سامان اور اپنی اصطلاحات و ایجادات کو ساتھ لے کر یہاں وارد ہوئے۔ اور چونکہ ہندوستان میں یہ بالکل نئی چیزیں تھیں، اس لیے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مترادف کی تلاش بیکار تھی۔ اس طرح وہی الفاظ یہاں رائج ہو گئے۔

کیونکہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو آج ہم اُردو کہتے ہیں اس کا "ہیولیٰ" اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ سندھ کو فتح کرنے والا لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے۔ جہازرانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی اور سندھ کے پنڈت بغداد جا کر اپنی زبان سے عربی میں کتابوں کے

ترجموں میں مدد دینے اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصوبوں پر سرفرازہ ہونے لگے۔

سندھ اور ملتان میں مسلمانوں کی ریاستیں تین سو برس تک قائم رہیں۔ اور آخر سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء) کے ہاتھوں ان دونوں ریاستوں کا خاتمہ ہوا۔ ان ریاستوں کا مذہبی تعلق بغداد اور مصر سے تھا اور خراسان، عراق، یمن، ایران اور مصر سے یہاں آنے والے تاجروں اور مسافروں کی برابر آمدورفت لگی رہتی تھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ سندھ اور ملتان میں دلیسی بولیوں کے ساتھ عربی و فارسی کا میل جول بڑھتا رہے، اور ایک نئی بولی کا ہیولیٰ تیار ہو۔ خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے کچھ نہ کچھ اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بزرگ بن شہریار ملاح جو ۳۰۰ھ مطابق ۹۱۲ء میں بحر ہند کے سواحل سے گذرتا رہتا تھا، اس نے اپنے بحری سفرنامہ میں جس کا نام "عجائب الہند" ہے کئی ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ ۲۷۰ھ مطابق ۸۸۳ء کا ایک قصہ ہم کو سناتا ہے، شہر الور واقع سندھ کے ایک ہندو راجہ نے منصورہ واقع سندھ کے مسلمان بادشاہ سے ایک ایسے مسلمان عالم کی درخواست کی جو اس کو اس کی زبان میں اسلام کی خوبیاں بتا سکے۔ بادشاہ نے ایک ایسے عراقی عالم کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی بہت سی بولیاں جانتا تھا۔ چنانچہ وہ گیا اور سب سے پہلے راجہ کی خدمت میں اپنا ہندی قصیدہ پیش کیا اور پھر قرآن کا ترجمہ کیا۔

بغداد کا سیاح اصطخری ۳۴۰ھ مطابق ۹۵۱ء میں سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ برس پہلے سندھ اور ملتان آیا تھا۔ وہ کہتا ہے:

"منصورہ (موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے، اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔"

اس کے بعد بغداد کا دوسرا سیاح ابن حوقل بھی جس کی سندھ اور ملتان میں سیاحت کا زمانہ ۳۵۸ھ مطابق ۶۹-۹۶۸ء ہے یہی کہتا ہے کہ

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے۔"

اس کے چند سال بعد ۳۷۵ھ مطابق ۹۸۵ء میں بشاری مقدسی ملتان آیا۔ وہ لکھتا ہے:

"یہاں (ملتان میں) فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔"

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ واقع سندھ کے حال میں لکھتا ہے:

"دیبل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے۔ اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں۔ اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں۔ سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر ٹکراتا ہے۔ یہ سب سوداگر ہیں۔ ان کی زبان سندھی اور عربی ہے۔"

ان معاصرانہ شہادتوں کی بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، جس کی حد اس زمانہ میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں ملتان مسلمانوں کے جملہ علوم و فنون کا مرکز اور درس گاہ تھا۔ اس کے بعد یہ مرکز ملتان سے لاہور کو اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے، پھر پنجابی اور بعد میں دہلوی۔ سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے۔ چنانچہ اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں، مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں۔

سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے۔ تینوں میں عربی اور فارسی کا میل ہے۔ صیغوں کے طریق میں

تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضرور ہے جس کی رو سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو انھیں بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے۔ یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں، اس کا آغاز انھیں بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے، جس کو دہلوی کہتے ہیں، مل کر معیاری زبان بن گئی، اور پھر دارالسلطنت کی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی۔

سلطان محمود غزنوی کے جانشینوں نے تقریباً دو سو برس تک پنجاب اور سندھ پر حکومت کی۔ اس عرصہ میں زندگی کی ہر سطح پر عربی و فارسی، خصوصاً فارسی، اور یہاں کی دیسی زبانوں کی باہمی آمیزش ہوئی اور ان زبانوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے دہلی وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اب اس مشترکہ زبان کا قدم اور آگے بڑھا۔ ان کی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہو گئی اور اس پورے ملک میں جہاں کہیں بول چال کی ایک زبان نہ تھی، ایک مشترک زبان ہند (آئندہ کی اُردو) کا ہیولیٰ تیار ہو گیا۔

اُردو کی تاریخ میں صوفیا کرام اور خصوصاً چشتیہ صوفیا کا بھی بڑا حصہ ہے۔ صوفیا کرام ہندوستان کے ہر حصہ میں مسلمان فاتحوں سے پہلے پہنچے اور وہاں اپنے اپنے علاقہ کی بولی سیکھی اور اس طرح ہر بولی میں عربی و فارسی اور خصوصاً فارسی کی آمیزش کا باعث بنے۔ ان کی زبانوں سے وقتاً فوقتاً نکلے ہوئے ابتدائی اردو کے الفاظ اور جملے مختلف تحریروں میں ملتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اختلاط اور میل جول نے ہر صوبہ کو متاثر کیا اور اس طرح اس نئی زبان[1] کو بھی مقامی اور صوبہ وارانہ اثرات نے داخل ہو کر مختلف بولیاں

---

[1] مراد ہے اُردو کی ابتدائی شکل ہے۔

میں منقسم کر دیا، جیسے دکھنی، گوجری، دہلوی، لکھنوی، بہاری، پنجابی وغیرہ۔ ہر صوبہ کی ہندوستانی (اُردو) بولی میں علیحدہ علیحدہ کچھ کچھ امتیازات پیدا ہو گئے تھے، اور اس لیے اس نئی زبان کا نام ہر جگہ الگ پڑا مثلاً دہلوی، دکھنی، گوجری، ہندی، ہندوی۔

اُردو زبان کا نام

جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو یہ ملک بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم تھا اور ہر ٹکڑے کا اپنا راجہ اور رہن سہن کے ڈھنگ تھے، اور اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی۔ ہر صوبے کی بولی الگ الگ تھی۔ لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا یعنی ہندی یا ہندیہ۔

اس سرزمین کا نام ہند یا ہندوستان، اور یہاں کی رہنے والی قوم کا ایک نام ہندو، اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، اور حقیقت میں یہ مسلمانوں ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک، اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک قوم، اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا۔

اس ملک میں عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر تلا تلا کر یہیں کی سی کوئی زبان بولنے لگے، جس کا نام انھوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی۔ اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اس گوجری، دکھن میں دکھنی اور اودھ میں اودھی کہنے لگے، مگر صوبہ وار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا۔

اُردو زبان کی قدیم تاریخ

از عین الحق فرید کوٹی

علم لسانیات کا پیش رو اگر ہم اس وقت کا پتہ لگانا چاہیں جب کہ زبان کے متعلق سائنسی تحقیقات کی بنیاد رکھی گئی، تو وہ ۱۷۷۲ء ہے، جس سال کہ جان گاٹفرائیڈ ہرڈر (Johann Gottfried Herder) (۱۷۴۴ء - ۱۸۰۳ء) کی مشہور تصنیف "زبان کے مآخذ" شائع ہوئی تھی۔

سنسکرت اور لسانیات کیونکہ اردو لسانیات کے سلسلہ میں بات سنسکرت تک پہنچتی ہے، اس لئے درج ذیل اقتباس کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہوگا جو سر ولیم جونز نے ۲ ستمبر ۱۷۸۶ء کو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے تیسرے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران کہا تھا:

"سنسکرت بلالحاظ اپنی قدامت کے ایک نہایت عمدہ ہیئت کی زبان ہے یہ یونانی سے زیادہ تکمیل یافتہ اور لاطینی سے زیادہ جامع ہے، اور ان دونوں کی نسبت لطیف اور شائستہ ہے، لیکن پھر بھی ان دونوں زبانوں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ افعال کے مخارج اور صرف نحو کے لحاظ سے یہ اتنی زیادہ ملتی جلتی ہیں کہ اسے محض ایک اتفاق کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر کوئی بھی محقق ان تینوں زبانوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کرے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تینوں زبانوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اگرچہ اب وہ سرچشمہ بذاتِ خود معدوم ہوچکا ہے نیز اس امر کے تسلیم کرنے کے لئے بھی کافی شواہد موجود ہیں کہ گاتھ قوم کی زبان اور کلٹی زبان بھی اسی سرچشمہ سے پھوٹی ہیں اور پھر قدیم فارسی کو بھی اسی رشتہ میں منسلک کیا جاتا ہے۔"

اس دن کے بعد سے جگہ جگہ اور خصوصاً یورپ میں سنسکرت اور دوسری زبانوں کا تقابلی مطالعہ ہونے لگا۔

سنسکرت کے تقابلی مطالعہ کے آغاز کے سلسلہ میں یہ امر قابل توجہ اور اہم ہے کہ سب سے پہلے ایک فرانسیسی یسوعی (JESUIT) پادری نے ۱۷۶۷ء میں فرانس

کے ایک مرکزی تعلیمی ادارہ کو ایک یادداشت بھیجی، جس میں ذکر تھا کہ لاطینی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ لیکن ادارہ مذکور نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اس یادداشت کو چالیس سال بعد پہلی بار اس وقت شائع کیا گیا جب یورپ میں سنسکرت کے متعلق کافی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔

اگرچہ سر ولیم جونز نے صاف صاف لفظوں میں آریائی گروہ کی بڑی بڑی زبانوں میں باہمی مماثلت اور ان کے ایک ہی ماخذ سے مشتق ہونے کا نظریہ پیش کر دیا تھا، لیکن افسوس کہ اس کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ تفصیل طلب موضوع تشنۂ تکمیل ہی رہ گیا۔

فریڈرک شلیگل (Friedrich Schlegel ۱۷۷۲ء ۔ ۱۸۲۹ء) نے ۱۸۰۵ء میں ایک کتاب "اہل ہند کی زبان اور حکمت" نامی شائع کی، جس میں ولیم جونز کے تجویز کردہ خیال کے مطابق یورپی زبانوں کا سنسکرت سے تفصیلی موازنہ کیا گیا تھا۔ ان زبانوں کے الفاظ اور صرف و نحو کی مماثلت کے مطالعہ کے بعد اس خیال کی پرزور حمایت کی کہ سنسکرت اور یورپی زبانوں، خاص کر یونانی، لاطینی اور جرمن کے مابین ایک گہرا رشتہ اور یک گونہ مطابقت موجود ہے۔ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے سب سے پہلے "تقابلی لسانیات" کی اصطلاح وضع کی۔

ہندوستان (پاک و ہند) کے شمالی حصہ کی جملہ زبانوں کی بنیاد کا مسئلہ صدیوں سے ادھیڑبن کا شکار ہے۔ آج سے کوئی ساڑھے تین ہزار سال قبل جب آریائی قبائل وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے، تو یہاں بسنے والے قبائل کی زبانوں کو مختلف ناموں سے یاد کیا کبھی اسے "مردھر اواک" (غیر زبان) کا نام دیا، یعنی ایسی زبان جو ان کی اپنی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ ناگ "ناگ بانی" کے نام سے پکارا یعنی ایسی زبان جو ناگا قبائل بولتے تھے یا وہ زبان جو ناگ دیوتا کے ماننے والے استعمال کرتے تھے۔ "اسر بھاشا" یعنی وہ زبان جو یہاں کے غیر آریائی بولتے تھے اور "ملیچھ بھاشا" یعنی ناپاک زبان قرار دیا۔ جب ذرا بعد میں علم کا چرچا ہوا اور مختلف زبانوں کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو آریائی زبان کے مقابلے میں مقامی زبانوں کو "دلسیا جا"

یعنی دیسی زبانیں کہا گیا یعنی وہ اپنی آریائی زبان کو غیر ملکی تصور کرتے تھے۔ زمانہ اور آگے بڑھا تو سنسکرت یعنی فطری زبان کے مقابلے میں مقامی زبانوں کو پراکرت یعنی خود رو زبان اور "اپ بھرنش" یعنی روبہ زوال زبان کا نام دیا گیا۔ غرضیکہ برہمنی گروہ سنسکرت جسے وہ دیو بانی (دیوتاؤں کی زبان) تصور کرتے تھے اور مقامی زبانوں کے درمیان ہمیشہ ایک مصنوعی حد فاصل قائم رکھنے میں کوشاں رہا۔

اسی برہمنی ذہنیت کے زیرِ اثر ہندوستان کے شمالی حصے کی زبانوں نے شروع ہی سے دو مختلف صورتیں اختیار کر لیں:

اول سنسکرت اور

دوسری پراکرت

سنسکرت زیادہ تر مذہب اور ادب کی زبان تھی، اس لئے اسے ہمیشہ مذہبی اور بالائی طبقے کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس (سنسکرت) روایتی زبان کو زندہ رکھنے کے لئے اکثر فرسودہ تراکیب اور متروک الفاظ کا سہارا لیا جاتا تھا، لیکن ان کاوشوں کے باوجود یہ مقامی اثرات سے دامن نہ بچا سکی، اور تو اور خود ویدوں کی زبان میں بھی مقامی عناصر موجود ہیں۔ ہاں، اس سعیٔ لاحاصل کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ یہ دیو بانی (دیوتاؤں کی زبان) عوام سے دور ہو کر زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی۔ اس کے برعکس پراکرتیں یعنی مقامی غیر آریائی زبانیں ہمیشہ عوام میں بول چال کے لئے استعمال ہوتی رہیں۔ یہ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں اور تمام تر لسانی محرکات سے اثر پذیر ہوتی رہیں۔ انہوں نے اپنے حقیقی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے میں آریائی عناصر کو سمو لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ گو ادبی اور عوامی زبانیں پہلو بہ پہلو نشو و نما پاتی رہیں، لیکن طبقاتی تفاوت کی بنا پر ایک بڑی حد تک ایک دوسری سے الگ تھلگ رہیں۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت جب ہندوستان میں ہندوؤں کی چھوٹی چھوٹی عملداریاں ختم ہو کر ایک متحدہ مرکزی حکومت کی بنیادیں استوار ہو گئیں تو قدیم ادبی زبان یعنی سنسکرت اپنے سرپرستوں سے محروم ہو جانے پر بطور ایک زندہ زبان کے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

اس طرح عوامی زبانوں کو آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ اب انہیں مذہبی اور ادبی تخلیقات کے لیئے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے کی موجودہ زبانیں براہِ راست انہیں عوامی زبانوں کے ارتقائی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

جب اہلِ مغرب برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے تو ان میں سے بعض متجسس ذہنوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے مطالعہ میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ یہ بات ان کے لئے ایک اچنبے سے کم نہ تھی کہ ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت کے سرمایۂ الفاظ کا ایک بڑا حصہ یورپی زبانوں سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ یورپ کے طول و عرض میں اس بات کا چرچا جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ جگہ جگہ سنسکرت کے درس و تدریس کے دارالعلوم کھول دیئے گئے اور تمام بڑی بڑی درسگاہوں میں سنسکرت کے بارے میں تحقیقی مراکز قائم ہو گئے۔ اس سلسلہ میں جرمنی سب سے پیش پیش تھا۔ ان تحقیقی مراکز کی بدولت یورپ اور ایشیا کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور زبانوں کے بارے میں معلومات کے ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ان کے ذہنوں پر سنسکرت کا بھوت کچھ اس حد تک سوار تھا کہ انہوں نے خالص تحقیقی کارناموں کے ساتھ ساتھ اپنے یک طرفہ مطالعہ کی بنا پر بعض اوقات کئی ایک غیر متوازی نظریوں کو بھی جنم دیا، جنہیں ان کے بلند بانگ دعوؤں اور بلند آہنگ ناموں کی وجہ سے بے چون و چرا قبول کر لیا گیا۔ برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے کی جملہ زبانوں کے سنسکرت الاصل ہونے کا مسئلہ بھی ان غیر متوازی نظریات میں سے ایک ہے، جو کہ ان زبانوں کے سرمایۂ الفاظ میں محض آریائی عنصر کی موجودگی کی بنا پر قائم کر دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں اس کے خلاف چند کمزور سی آوازیں اٹھیں لیکن وہ میکس مولر، ہارنلے، جان بیمز، جارج گریرسن اور ولیم جونز جیسے باون گزوں کے سامنے کارگر نہ ہو سکی۔ یہ نام لسانیات کے طلبہ کے ذہنوں پر کچھ اس طرح سے سایہ فگن رہے کہ پچھلی قریباً ڈیڑھ صدی میں کسی میں یہ جرأت پیدا نہ ہوئی کہ وہ اس غلط نظریئے کو چیلنج کر سکے۔

پاک و ہند کی آزادی کے بعد پھر سے زبانوں کے بارے میں تحقیق و تدقیق کا شوق

پیدا ہوا اور حقائق کا نئے سرے سے جائزہ لیا جانے لگا۔ اس سے غور و فکر کی کئی ایک نئی راہیں کھل گئیں۔

موجودہ تحقیق کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاک و ہند کے شمالی حصے کی زبانوں (پنجابی اور سندھی وغیرہ) کی اصل سنسکرت نہیں بلکہ وہ زبانیں ہیں جو اس وقت یہاں کے باشندے بولتے تھے جب آریہ یہاں وارد ہوئے، اور کیونکہ آریوں کی آمد سے پہلے منڈا قبائل، نگر یٹو، آسٹرک، اور دراوڑ بستے تھے اور دراوڑ ایک اچھی تہذیب کے مالک تھے، اس لئے آریوں کی ان قوموں اور خصوصاً دراوڑی زبانوں سے واسطہ پڑا۔ اس سلسلہ میں درج ذیل اقتباسات قابلِ توجہ ہوں گے:

"آثارِ قدیمہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل وادیٔ سندھ میں جو قوم آباد تھی وہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے تہذیب و تمدن کے ایک بلند مقام پر فائز تھی۔ لامحالہ اسکی زبان بھی اسی حد تک ترقی یافتہ ہوگی۔ منقش مہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوم علامتی فنِ تحریر سے آشنا تھی۔ افسوس ہے کہ یہ رسم الخط ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا، اس لئے اس زبان کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں، یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زبان کے سرمایۂ الفاظ کا کچھ حصہ موجودہ پنجابی، سندھی، بلوچی، براہوی اور پشتو میں ضرور موجود ہوگا، کیونکہ اگر ان زبانوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے سرمایۂ الفاظ میں کئی ایک غیر آریائی اصل کے الفاظ بھی ملیں گے۔ لامحالہ ان الفاظ کا ایک بڑا حصہ اسی قدیم زبان سے تعلق رکھتا ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں کی (غیر آریائی) زبان یا زبانوں نے آریائی زبانوں میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت کھو دی۔ مگر درج ذیل اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کی غیر آریائی زبانوں نے آریائی زبانوں میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت کھوئی نہیں:

"شروع میں جبکہ علم اللسان ابھی اپنی ابتدائی منازل میں ہی تھا تو ماہرینِ شرقیات نے اردو زبان کے سرمایۂ الفاظ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے سنسکرت زبان کی شاخ قرار دے دیا۔

گو عصرِ حاضر میں موئن جو دڑو اور ہڑپّہ وغیرہ مقامات کی کھدائیوں کی بدولت کئی ایک نئے تاریخی شواہد سامنے آچکے ہیں، لیکن پھر بھی اردو زبان پر سنسکرت الاصل والا پرانا لیبل چسپاں ہے۔ فی زمانہ (۱۹۵۶ء) مغربی محققین یا تو مردہ اور قدیم زبانوں کے کھوج میں سرگرداں ہیں، یا پھر مغربی زبانوں کی چھان بین میں مصروف ہیں۔ مشرقی محققین اکثر مغرب کی کاسہ لیسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں اور آزادانہ طور پر تحقیق و تدقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔" سنسکرت اور اردو کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد نتیجہ نکالا کہ:

"صرف و نحو کے لحاظ سے اردو اور سنسکرت میں نہ صرف فروعی بلکہ اصولی اور بنیادی اختلافات موجود ہیں۔ یہ بات عقل سے بعید ہے کہ ایک زبان کی شاخ اس سے بالکل مختلف ہو۔ کم از کم دنیا کی زبانوں کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگر محض سرمایۂ الفاظ کے اشتراک کو ہی باہمی رشتے کا معیار قرار دیا جائے تو خود فارسی زبان میں عربی الاصل الفاظ کا اتنا زیادہ عنصر موجود ہے کہ اس لحاظ سے اسے بجائے آریائی گروہ کی شاخ کے سامی زبانوں کے گروہ سے منسلک تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ اگر فارسی زبان کو باوجود اس کی لغوی مماثلت کے سامی زبانوں کی شاخ نہیں مانا جاسکتا تو پھر اردو کو محض لغوی مطابقت کی بنا پر سنسکرت کی شاخ کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔"

ابھی تک مجھے (عین الحق فریدکوٹی کو) دراوڑی زبانوں کے گہرے مطالعہ کا موقع نہیں ملا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے ماہر لسانیات ڈاکٹر لیتھم کے نظریات کی اساس پر دراوڑی زبانوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا کہ:

"انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بعض ماہرین لسانیات نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے کی زبانیں دراوڑی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اردو اور پنجابی کا دراوڑی زبانوں کی صرف و نحو اور سرمایۂ الفاظ سے اس قدر اختلاف ہے کہ اس نظریئے کو کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی۔"

آخر میں نتیجہ نکالا کہ؛

"جب تحقیق و تدقیق کے بعد یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ صحیح معنوں میں

سنسکرت اور دراوڑی زبانوں میں سے کوئی بھی اُردو کی جد امجد قرار نہیں دی جا سکتی تو ہمارے لئے یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں کہ اُردو زبان کا حقیقی سرچشمہ خود وادیٔ سندھ کی وہ قدیم زبان ہے جو کہ آریوں کی آمد سے قبل یہاں رائج[1] تھی۔"

"جب کہ لبروک، الفنسٹن، لینتھم، ولیم ہنٹر، جارج گریرسن وغیرہ (لسانیاتی) تحقیقات میں مصروف تھے، تو اس وقت برصغیر (پاک و ہند) کے شمالی حصّے کی تاریخ آریوں کی آمد سے شروع ہوتی تھی، اور آریوں کی آمد سے پہلے ایک ایسا خلا تھا جس پہ تاریکی کا گہرا پردہ پڑا ہوا تھا، اِس لئے ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ موجودہ زبانوں کے سرچشمہ کو سنسکرت سے مختلف مگر آریائی الاصل زبان قرار دیں۔ اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے اور ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زبان جس سے آنے والے آریائی قبائل کو واسطہ پڑا، ہڑپہ اور موئن جوڈرو کے باشندوں کی زبان تھی۔ اس طرح مقامی اور نووارد زبانوں کی باہمی آمیزش سے کئی ایک بولیوں نے جنم لیا جو کہ موجودہ زبانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سنسکرت نے مقامی زبانوں کو متاثر کیا، انہیں نیست نابود کر کے کسی نئی بولی کی طرح نہیں ڈالی، بلکہ حق تو یہ ہے کہ مقامی بولیوں کی مقبولیت کے زیرِ اثر خود ختم ہو گئی[2]۔ مقصد یہ ہے کہ کسی زبان کا دوسری زبان سے متاثر ہونا، اگرچہ یہ اثرات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں اور اس کا

---

[1] مگر یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آریوں کی آمد کے وقت وادی سندھ میں دراوڑ منڈا قبائل آباد تھے۔

[2] مطلب یہ کہ پراکرتوں نے آگے بڑھ کر سنسکرت کی جگہ لے لی۔

دوسری زبان سے مشتق ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔"

"دراوڑی اور وادیٔ سندھ کی موجودہ زبانوں میں لغوی مطابقت، پیشہ ورانہ فرقوں کے مشترک نام اور اسمائے ضمیر کی باہمی مماثلت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ آریوں سے قبل وادی سندھ میں دراوڑی اور منڈا اقوام کا دور دورہ تھا، اور ان کی زبانیں عوامی زبانوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ جب آریائی قبائل آئے تو جہاں خود انھوں نے یہاں کی مقامی زبانوں سے گہرا اثر قبول کیا وہاں کسی حد تک مقامی زبانوں کو بھی متاثر کیا، لیکن ان کے اقلیت میں ہونے کی بنا پر یہ اثرات اتنے ہمہ گیر نہ تھے۔ اس سے زیادہ تر مقامی زبانوں کا لغوی پہلو ہی متاثر ہوا اور صرف و نحو کے ڈھانچے نے کوئی خاص اثر قبول نہ کیا۔ اہل علم حضرات نے ان مقامی زبانوں کو قدیم پراکرت کے نام سے یاد کیا ہے، اور اس قدیم پراکرت کو وادیٔ سندھ کی موجودہ زبانوں کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ دوسرے معنوں میں ان کی مورثِ اعلیٰ سنسکرت نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر دراوڑی زبانیں ہیں۔"

اُردو زبان کا پس منظر

اُردو زبان کی ابتدا کیسے ہوئی، کب ہوئی اور کہاں ہوئی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے بارے میں پچھلے سوا سو سال سے متواتر بحث تمحیث کا سلسلہ جاری ہے۔

کئی ایک اہل علم اصحاب نے اس بارے میں اپنی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا مطالعہ ہمارے لئے کسی واضح نظریے تک پہنچنے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ان کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اُردو زبان امیر خسروؒ کی ایجاد ہے، کوئی

اس کی دریافت کا سہرا ولی دکنی کے سر باندھتے ہیں، کچھ اہلِ علم اسے عہدِ شاہجہان میں قلعہ معلّیٰ کی پیداوار بتلاتے ہیں، تو دوسرے اس کے آغاز کو محمد بن قاسم کے حملے سے منسوب کرتے ہیں۔

کسی بھی زبان کی ابتدا کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان نے انسان کے ساتھ ہی جنم لیا اور پھلتی پھولتی، ادلتی بدلتی ہم تک پہنچی ہے، یعنی دُنیا کی زبان کا بنیادی عنصر اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود حضرتِ انسان کا وجود، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زبان انسان سے بھی پہلے صفحۂ ہستی پر موجود تھی۔ کیونکہ جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جہاں تک باہمی اظہار اور ابلاغ کا تعلق ہے وہ جہدِ للبقاء کے تقاضے کی بدولت یک خلیہ امیبا سے لے کر ارتقائے حیات کی آخری کڑی تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ لیکن زبان کے اس عمومی پہلو سے بحث کرنا مطلوب نہیں اور نہ مجموعی طور پر انسانی زبان ہمارا موضوع ہے۔ ہمیں تو صرف اُردو زبان کے بارے میں بات کرنا ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ اُردو زبان کو کوئی خاص استثناء حاصل نہیں۔ اس کی تشکیل بھی انھیں قوانینِ فطرت کی مرہونِ منت ہے جن کے تحت دوسری انسانی زبانوں نے جنم لیا اور ان کی طرح ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کر کے موجودہ صورت اختیار کی ہے۔

آغازِ اُردو کے بارے میں چند نظریات

سرسید احمد، امام بخش صہبائی اور مولانا آزاد کے نظریات کے مطابق اُردو عہدِ شاہجہان (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) میں دہلی کے گردو نواح میں پیدا ہوئی۔

میر امن دہلوی اور سید حیدر بخش اسے عہدِ اکبری (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) میں مختلف قوموں کے آزادانہ میل جول کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر گل کرائسٹ (GILCHRIST) اپنی تصنیف "ہندوستانی لسانیات" (HINDOSTANI PHILOLOGY) میں رقم طراز ہیں کہ :-

"ہندوستانی (اردو) زبان نے امیر تیمور کے حملہ (۹۹-۱۳۹۸ء) کے دوران موجودہ صورت اختیار کی"۔

مولوی محمد حسین آزاد اور سعید مارہروی کا خیال ہے کہ اردو زبان برج بھاشا اور فارسی ملاوٹ سے ظہور میں آئی جسے ہم زیادہ سے زیادہ قطب الدین ایبک، (۱۱۹۲ء) یا ۱۲۱۰ء) کے دور سے شمار کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور سید سجاد ظہیر 'ہندوی' اور فارسی کی آمیزش کو محمود غزنوی ۹۹۸ء تا ۱۰۳۳ء کے زمانے سے منسوب کرتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کی رائے ہے کہ اردو کی ابتدا محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے (۷۱۲ء) کے وقت ہی سے شروع ہو گئی تھی۔

مغربی محققین نے اس پہلو میں کافی محتاط روش اختیار کی ہے۔ سر جارج گریرسن اور سر چارلس لائل نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے جب مقامی زبانوں میں فارسی الفاظ کی آمیزش شروع ہوئی تو اس کے نتیجہ میں ایک نئی زبان نے جنم لیا جو آگے چل کر اردو کہلائی۔

ان سب نظریات کی تہہ میں ایک ہی خیال کارفرما نظر آتا ہے کہ اردو زبان کی پیدائش پراکرتوں میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ یہ مفروضہ قائم کرنے بعد اب صرف یہ تعین کرنا باقی تھا کہ یہ آمیزش کب ہوئی؟ اس بارے میں ہر ایک نے اپنی اپنی فہم و فراست کے مطابق لگانے کی کوشش کی اور اس طرح محمد بن قاسم کے حملہ (۷۱۲ء) سے لے کر عہد شاہجہاں (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) تک ہزار سال کے عرصہ میں مختلف ادوار کو اردو زبان کی پیدائش کی طرف منسوب کر دیا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ نظریات قائم کرتے وقت نہ صرف اردو زبان کے سرمایۂ الفاظ کے عناصر کو ہی یکسر نظر انداز کر دیا گیا بلکہ اس کی صرف و نحو اور صوتی پہلو کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس پہلو کو باقی سب امور پر فوقیت حاصل ہونا چاہیئے تھی۔

ویدک زبان: برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے میں وارد ہونے والے آریائی قبائل کی مذہبی کتابوں یعنی ویدوں کی زبان اور خاص کر رگ وید کی زبان ویدک زبان کہلاتی ہے۔

ویدوں کا زمانۂ تالیف ۱۵۰۰ سال قبل از مسیح آریوں کے برصغیر میں وارد ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کتاب یعنی "اتھروید" کے بارے میں تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس کی تالیف کا عہد چار سو قبل از مسیح کے لگ بھگ ہے، یعنی چاروں ویدوں کی تخلیق کا زمانہ کوئی ایک ہزار سال کے عرصہ تک پھیلا ہوا ہے۔

یاد رہے کہ برصغیر پاک و ہند میں فنِ تحریر تقریباً چوتھی صدی قبل از مسیح میں رائج ہوا۔ ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں ویدوں کے بھجن سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہے۔ لازمی طور پر یہ بھجن زمانے کے فطرتی ارتقاء سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ علماء کے ایک بڑے طبقے کا خیال ہے کہ ویدوں کی زبان مقامی غیر آریائی عناصر سے متاثر ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں بھارت کے مشہور ہندو مورخ ڈاکٹر رادھاکمود مکرجی کا قول پیش کرتے ہیں:-

"ویدوں کی زبان، کلاسکی سنسکرت اور پراکرتوں میں بلکہ خود برصغیر (پاک و ہند) کے شمالی حصہ کی زبانوں میں دراوڑی عنصر موجود ہے۔ ماہرین لسانیات تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شمالی ہند میں وارد ہونے کے بعد آریائی زبان میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی جو کہ براہ راست دراوڑی اثرات کا نتیجہ تھی۔"

واضح رہے کہ ویدک زبان آریائی زبان ہونے کے باوجود ایک ہزار سال قبل وارد ہونے والے آریائی قبائل کی زبان سے کافی حد تک مختلف ہوگی، لیکن چونکہ اس اولین عہد کی زبان کے نمونے فراہم نہیں ہوئے ہیں، اس لیے ان اختلافات کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں! البتہ باقی آریائی زبانوں سے تقابلی جائزہ کے بعد اس کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سنسکرت: آج سے کچھ عرصہ پہلے سنسکرت کو ایک ایسی خالص آریائی زبان تصور کیا جاتا تھا جو کہ یکسر غیر آریائی عناصر سے پاک و مبرا ہو۔ لیکن

جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ اس قسم کے نظریات سراسر جذبات پر مبنی تھے۔ درحقیقت دوسری زندہ زبانوں کی طرح اپنے ارتقا کے دوران سنسکرت بھی اپنے گرد و نواح میں بولی جانے والی غیر آریائی زبانوں سے گہرے طور پر متاثر ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم دو روسی ماہرین سنسکرت ایوانوف اور تاپوروف کی حالیہ تصنیف "سنسکرت" مطبوعہ ماسکو ۱۹۶۸ء سے اقتباس پیش کرتے ہیں:

"یہ باور کرنے کے لئے شواہد موجود ہیں کہ برصغیر (پاک و ہند) کے شمالی حصہ میں سنسکرت کے پہلو بہ پہلو غیر آریائی زبانیں بھی مروّج تھیں، جہاں کہ اب بھی بعض علاقوں میں یہ قدیم زبانیں موجود ہیں (غالباً بروہی زبان کی طرف اشارہ ہے)۔ سنسکرت کا ان (قدیم غیر آریائی) زبانوں سے ایک طویل عرصہ تک متواتر میل جول رہا۔ سنسکرت میں غیر آریائی عنصر کی موجودگی اس کا بیّن ثبوت ہے۔ جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سنسکرت کے سرمایۂ الفاظ میں یہ (غیر آریائی عنصر کے) انجذاب کا عمل قدیم ہی سے شروع ہے اور اس کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔"

پراکرت: برصغیر (پاک و ہند) کی ہند آریائی زبانوں کے ذکر میں پراکرت کا تذکرہ ایک پہیلی سے کم نہیں۔ عام طور پر سنسکرت کے مقابل اس کے معنی خودرو یا غیر شائستہ زبان کے لئے جاتے ہیں۔ متقدمین نے سنسکرت کے مقابلے میں، جیسے کہ وہ دیوبانی (دیوتاؤں کی زبان) کہتے تھے، پراکرتوں کو ناگ بانی (سانپوں کی زبان یا سانپ کے پجاریوں کی زبان)، یا اسر بھاشا (شیطانوں کی زبان) وغیرہ قسم کے ناموں سے یاد کیا ہے۔

عہد وسطیٰ کے علما بھی پراکرت کے بارے میں کسی واضح نظریئے کے حامل نہ تھے۔ علماء کا ایک طبقہ اسے سنسکرت سے مشتق (سنسکرت سے نکلی ہوئی) قرار دیتا تھا جیسے کہ ہیم چندر کا قول ہے کہ

"سنسکرت ایک بنیاد ہے اور جس زبان نے بھی اس سے جنم

لیا وہ پراکرت کہلائی۔"

اس کے برعکس "کوبالنکارا" کے مفسر نامی سادھو کا قول ہے کہ

"پراکرت کا لفظ پراکرتی بمعنی ازلی اور قدیم سے مشتق ہے۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جسے بچے اور عورتیں بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں اور یہی تمام زبانوں کی بنیاد ہے۔ بارش کے پانی کی طرح قدیم عہد میں اس کا ایک ہی روپ تھا لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ علاقائی اثرات کے تحت اس کی ہیئت میں اختلافات رونما ہو گئے جس نے آگے چل کر سنسکرت اور دوسری زبانوں کی صورت اختیار کر لی۔"

اہل مغرب کی تقلید میں ہمارے ہاں بھی اکثر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ پراکرت کسی ایک زبان کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بذات خود پراکرت کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ زبانوں کے ایک گروہ کا نام ہے جس میں کہ بنگال سے لے کر سندھ تک کی مختلف زبانیں شامل ہیں۔

اپ بھرنش: اپ بھرنش سے مراد ایسی زبان ہے جو صرف و نحو کے اصولوں کے مطابق نہ ہو، یا عامیانہ زبان۔ اپ بھرنش کے بارے میں بھی علماء کے ہاں گہرا تضاد پایا جاتا ہے، بلکہ اس مسئلہ میں تو نظریاتی اختلافات نہایت شدید ہیں۔ مارکنڈیہ کے نزدیک اپ بھرنش پراکرت کی ہی ایک شاخ ہے، لیکن وررروچی اسے پراکرت سے خارج تصور کرتا ہے۔ اس نے اپنی پراکرت کی مشہور گرامر "پراکرت پرکاش" میں اپ بھرنش کا ذکر تک نہیں کیا۔

"کوہا ورس" کے مؤلف واڈن کے نزدیک وہ تمام زبانیں جو سنسکرت سے مختلف ہیں اپ بھرنش کہلاتی ہیں۔

واگ بھٹ نے اپنی کتاب "واگ بھٹ النکارہ" میں زبانوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش اور

پشاچی ۔ اس کے نزدیک اپ بھرنش مختلف علاقوں کی مقامی خالص زبانوں کا نام ہے ۔

غرضیکہ قدما اور عہد وسطیٰ کے علماء کے ہاں زبانوں کی تقسیم کے سلسلہ میں کوئی مسلمہ اصول یا واضح نظریات موجود نہ تھے ۔ اس عہد کے علماء اپنی اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اصول وضع کر لیتے تھے اور ان کی بنیادوں پر اپنے افکار کی عمارت استوار کر دیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مختلف نظریات کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے ۔ موجودہ دور کے سنسکرت دانوں نے جو کہ ساتھ ہی ماہرین لسانیات کا درجہ بھی رکھتے ہیں، اپنے خصوصی مطالعہ اور یک طرفہ رجحانات کی بدولت برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصے کی تمام زبانوں کو آریائی گروہ سے منسلک قرار دے دیا اور ان زبانوں پر یہ غلط لیبل اب کچھ اس طرح چسپاں ہو چکا تھا کہ اس کے بغیر ان زبانوں کا ذکر قریب قریب ناممکن نظر آتا ہے ۔

وقت کا تقاضا ہے کہ جدید تحقیق کی روشنی میں ان اصطلاحات کا نئے سرے سے جائزہ لے کر ان کے مفاہیم کا صحیح تعین کیا جائے ۔ عہد وسطیٰ کے ایک عالم سوم دیو مؤلف "کتھا سرت ساگر" نے برصغیر کی جملہ زبانوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے، یعنی سنسکرت، پراکرتیں اور دیسی بھاشائیں (اس سے تمام غیر آریائی زبانیں مراد ہیں)

سنسکرت : وسیع معنوں میں ہم اسے ویدوں سے لے کر کالی داس کے ڈراموں میں مستعمل زبان تک سے مراد لے سکتے ہیں ۔

پراکرت : وہ مقامی زبانیں جو کہ گہرے طور پر سنسکرت سے متاثر ہیں یا جن کے ادبی روپ میں سنسکرت کا رنگ نمایاں ہے جیسے کہ ماگدھی، مہاراشٹری اور ان کی شاخیں ۔

اپ بھرنش یا دیسی بھاشائیں : وہ مقامی زبانیں جو کہ بنیادی طور پر سنسکرت

سے اختلاف رکھتی ہیں۔ جیسے کہ دراوڑی زبانیں جن میں ملیالم، تامل، تلگو، کناڑی، بروہی وغیرہ شامل ہیں۔ ساہرایا، منڈا، ان میں منڈاری ہنتھالی، بھیلی وغیرہ زبانیں داخل ہیں۔ پشاچی، اس میں پنجابی، سندھی، کشمیری، ہریانوی اور اردو (جو پنجابی سے مشتق ہے) شامل ہیں۔ دردا، اس میں پشتو، بلتی، شینا اور کافرستان کی مختلف زبانیں ہیں۔

شمالی ہند کی قدیم زبانیں

اردو زبان کی جائے پیدائش کے بارے میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن علماء کی اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ اس کے چشمے برصغیر کے شمالی حصے سے ہی پھوٹے ہیں۔ اس لئے اردو زبان کے حسب نسب کا تعین کرنے کے لئے اس خطے کی قدیم زبانوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

کلاسکی ہندو ادب کی رو سے برصغیر کے شمالی حصے میں ذیل کی اپ بھرنشیں مروج تھیں:

شورسینی: یہ دوآبہ گنگا جمنا کے علاقہ میں مروج تھی جس میں کہ متھرا کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آگے چل کر یہی زبان برج بھاشا کہلائی، مسلمانوں کی آمد کے وقت بھی یہ زبان برج بھاشا کے نام سے موسوم تھی۔

کیکیہ: جمنا سے لے کر قدیم دریشد اوتی (جدید ہاکرہ ندی) کے درمیانی علاقہ میں مروج تھی۔ ہریانوی اسی زبان کی موجودہ ترقی یافتہ شکل ہے۔

پشاچی: دریشد اوتی سے لے کر دریائے اٹک تک یعنی تمام غیر منقسم پنجاب میں مروج تھی۔ موجودہ پنجابی اور اس کی تمام علاقائی بولیاں مثلاً مالوی، دوآبی، ماجھی، لمی، ملتانی، سرائیکی، دھنی، پوٹھوہاری، پہاڑی اور ہندکو (صوبہ سرحد کی پنجابی بولی) وغیرہ اسی پشاچی کے کنبے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

برج بھاشا یا پنجابی: جب یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اردو زبان

نے برصغیر کے شمالی حصّے میں جنم لیا تو اس کا سرچشمہ ہونے کی دعویدار کے طور پر صرف دو زبانیں میدان میں باقی رہ جاتی ہیں یعنی برج بھاشا اور پنجابی۔ شروع شروع میں اردو زبان کے برج بھاشا سے مشتق ہونے کا نظریہ ایک امر مسلمہ کا درجہ رکھتا تھا تاوقتیکہ حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں اس نظریے کو چیلنج نہیں کیا۔ پنجابی، اردو اور برج بھاشا کے تقابلی مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نہیں بلکہ پنجابی سے مماثلت رکھتی ہے۔

جب ہم اردو زبان کی صرف ونحو کا پنجابی اور برج بھاشا کی صرف ونحو سے موازنہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ جہاں اردو اور پنجابی کے درمیان گہرا رشتہ موجود ہے وہاں اس کے برج بھاشا سے اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہے مثلاً

(ا) مصدر بنانے کے لئے اردو اور پنجابی میں فعل کے آخر میں "نا" کا لاحقہ زائد کرتے ہیں۔ جیسے مار سے مارنا لیکن برج بھاشا میں اس کے لئے "بو" "وو" یا "نو" کے لاحقے مستعمل ہیں جیسے "ماربو" وغیرہ۔

ب۔ اسمائے صفت کے لئے اردو اور پنجابی میں صفت کے آخر میں "ا" (الف) زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے کالے سے کالا، میٹھے سے میٹھا اور بھلے سے بھلا، لیکن برج بھاشا میں اس کی جگہ واؤ مجہول کا اضافہ کرتے ہیں، جیسے کالو، مٹھو، بھلاو وغیرہ۔

اس کے علاوہ ایک اور طرح بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان کی اصل دراوڑی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ماہرین لسانیات نے دنیا کی جملہ زبانوں کو ہیئت کے لحاظ سے ان تین زمروں میں تقسیم کیا ہے:

(ا) انفرادی (ISOLATING)

(ب) تالیفی یا التصالی (AGGLUTINATIVE)

(ج) تصریفی (INFLECTIONAL)

ا۔ انفرادی: اس گروہ کی زبانوں میں بنیادی الفاظ کے ساتھ کوئی لاحقے یا سابقے استعمال نہیں کئے جاتے۔ فقرہ بنانے کے لئے الفاظ کو

اپنی اصلی صورت میں پہلو بہ پہلو ترتیب دے دیا جاتا ہے۔ آج کل اس کی واحد مثال چینی زبان ہے۔

ب۔ تالیفی یا اتصالی: سامی اور آریائی گروہ کی زبانوں کو چھوڑ کر دنیا کی قریب قریب تمام دوسری زبانیں اسی گروہ میں شمار ہوتی ہیں۔ ان زبانوں میں بعض اوقات بنیادی الفاظ کے ساتھ لاحقے لگانے سے مطلوبہ معنی حاصل کر لئے جاتے ہیں، لیکن ان میں بنیادی الفاظ اور لاحقوں کو ایک دوسرے سے بآسانی جانا جاسکتا ہے۔ اُردو زبان اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔

ج۔ تصریفی: سامی، آریائی اور بعض قدیم امریکی زبانیں اسی گروہ کی بڑی شاخیں ہیں۔ انھیں زبانوں کے ارتقاء کے سلسلہ میں سب سے ترقی یافتہ کڑی قرار دیا جاتا ہے۔ ان زبانوں میں کفایت لسانی اور سہل لسانی کے عمل کی بدولت لاحقوں اور سابقوں کی صورت ہی اس حد تک مسخ ہو چکی ہے کہ ان کی اصل کا صحیح طور پر پتہ لگانا ناممکن ہے۔ اسی طرح حذف و انجذاب کے زیرِ اثر لاحقے (لفظوں کے) مادوں کے ساتھ اس طرح شیر و شکر ہو چکے ہیں کہ ان کا آپس میں تمیز کرنا دشوار ہے۔ عربی، سنسکرت، فارسی اسی گروہ سے ہیں۔

مذکورہ بحث سے یہ واضح ہے کہ اُردو زبان نہ تو انفرادی ہے اور نہ زبانوں کے تصریفی گروہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی ہیئت کے لحاظ سے اسے آریائی زبانوں کے گروہ کی شاخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بلکہ اس کے برعکس واضح طور پر یہ زبانوں کے تالیفی گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس (تالیفی) کا ڈھانچہ برصغیر کی قدیم زبانوں کے دراوڑی گروہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

سنسکرت اور فارسی دونوں آریا الاصل زبانیں ہیں۔ تقابلی صرف نحو کی رو سے یہ تصریفی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس گو اُردو زبان کو سنسکرت کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے، لیکن یہ تالیفی ہونے کی بنا پر اس سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ذیل میں ہم تین نمائندہ آریائی زبانوں کی گردان سے موازنہ پیش کرتے ہیں تاکہ یہ واضح

ہو سکے کہ بنیادی طور پر ان میں کس حد تک اختلاف موجود ہے :

دادنؔ مصدر سے فعل حال کی گردان

فارسی	می دہد	می دہند	می دہی
	می دہید	می دہم	می دہیم
سنسکرت	داداتی	دادتی	داداسی
	داتا	دادامی	دادامس
یونانی	دیداسی	دید آسی	دیداس
	دیداتی	دیدامی	دیدامن
اُردو	وہ دیتا ہے	وہ دیتے ہیں	تو دیتا ہے
	تم دیتے ہو	میں دیتا ہوں	ہم دیتے ہیں

جہاں اردو اور فارسی میں صرف چھ صیغے ہیں وہاں سنسکرت میں تثنیہ کے تین صیغے ملا کر کل نو صیغے ہوتے ہیں ۔ یونان میں حاضر اور غائب کے تثنیہ کے صیغے ملا کر آٹھ صیغے ہوتے ہیں۔

تذکیر و تانیث

سنسکرت میں تذکیر و تانیث کا جنس کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک رسمی حیثیت کی حامل ہے جیسا کہ اردو میں ہم دُکھ کو مذکر اور اسی معنوں میں تکلیف کو مونث گردانتے ہیں ۔ سینا (فوج) جو کہ صرف مردوں پر مشتمل ہوتی ہے ، صرف آخری "الف" کی بنا پر ، جو کہ سنسکرت میں تانیث کی علامت ، مونث تسلیم کی جاتی ہے ، اور پنگھٹ ، جہاں کہ صرف عورتوں

لہ دادن = دینا

کا جنگھٹ ہوتا ہے، مذکر شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی چیز کا نام مذکر، یا لاجنس ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ کنارے کے لئے "تٹ" (مذکر) "تٹی" (مونث) اور "تٹو" (لاجنس) سے کوئی بھی لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چھلنی کے لئے "تنتو" (مذکر) "چالنی" (مونث) اور "پرپون" (لاجنس) کے الفاظ موجود ہیں۔

اگرچہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں، لیکن عام طور پر سنسکرت میں کسی لفظ کی تذکیر و تانیث کا اندازہ بلالحاظ جنس کے لفظ کے آخری حرف سے لگایا جاتا ہے، جیسے کہ "الف" کا لاحقہ مؤنث کی علامت ہے اور یائے معروف (ی) مذکر کی۔ اس لئے جہاں کنیا (لڑکی) سوسا (بہن) پرتیبھا (عکس) اور بھاشا (زبان) مؤنث ہیں وہاں سینا (فوج) بھی مؤنث ہے۔ اسی طرح جہاں پتی (مالک، خاوند) اہی (سانپ) اور منی (جواہر) وغیرہ مذکر ہیں۔ وہاں سکھی (دوست) بھی مذکر ہے۔ خواہ اس سے مراد سہیلی ہو یا دوست، اگرچہ آج کل اس کا زیادہ تر استعمال سہیلی کے معنوں میں ہوتا ہے، لیکن قدما اسے مذکر ہی استعمال کرتے تھے۔ واؤ کا لاحقہ مذکر، مؤنث اور لاجنس تینوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، جیسے کہ ششو (لڑکا) سیتو (پل) اور مدھو (بہار) مذکر ہیں لیکن مدھو (جب شہد کے معنوں میں استعمال ہو) دھینو (گائے) اور وسو (دولت) مؤنث ہیں۔ تنو (جسم) لاجنس ہے۔

سنسکرت کو گنگا اور سندھ کی وادی میں قدم رکھے ہوئے جب کچھ عرصہ گذر گیا تو اس کی گرامر کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ سنسکرت میں عام طور پر صیغہ مؤنث کے لئے لفظ کے کے آخر میں "الف" کا لاحقہ استعمال ہوتا ہے، جیسے "اپسرا (پانی میں رہنے والی جل پری، سمندر کی ملکہ) سرد پنکھا (خوبصورت ناک والی)۔ اسی قاعدے کے مطابق قدیم ہندو عورتوں کے نام سرما، رمبھا، یشودھا، رادھا، سیتا وغیرہ

رکھے جاتے تھے۔ لیکن ایک وقت آیا کہ سنسکرت زبان کے بولنے والوں نے مؤنث کے لئے "الف" کے ساتھ یائے معروف (ی) کا استعمال بھی شروع کر دیا، جیسا کہ سرسوتی، گندھاری، کنتی، دروپدی وغیرہ۔ اگرچہ قدیم سنسکرت میں لفظ کے بعد یائے معروف (ی) کا لاحقہ مذکر کی علامت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ واضح طور پر یہی ہو سکتی ہے کہ اکثر دوسری باتوں کی طرح مؤنث بنانے کا یہ طریقہ بھی آریوں نے وادیٔ سندھ میں پہلے سے آباد قوموں سے مستعار لیا۔ آج بھی پنجاب کے دیہاتوں میں عورتوں کے نام یائے معروف کے لاحقہ کے ساتھ رکھے یا پکارے جاتے ہیں جیسا کہ ہرنامی، سنتی، دلاری، رامی، رجی، بھاگی وغیرہ، اور مردوں کے "الف" کے لاحقے کے ساتھ ہرناما، سنتا، راما، ملکھا، شیرا، نورا وغیرہ۔ لیکن جہاں زیادہ تر آریائی تہذیب کا زور رہا ہے وہ آج بھی عورتوں کے نام "الف" کے لاحقہ کے ساتھ کملا، شیاما، لیلا، شانتا وغیرہ رکھے جاتے ہیں اور مردوں کے بنارسی، کاشی، ملکھی وغیرہ۔

فارسی صرف و نحو کو لیں تو وہاں بھی کوئی ایسا مسلمہ لاحقہ نظر نہیں آتا کہ جس سے کسی چیز کی تذکیر و تانیث کا پتہ چل سکے۔ کچھ اسماء تو ایسے ہیں کہ جن کی صنف خود ان کے نام سے ظاہر ہے جیسے کہ مادر، پدر، دیو، پری وغیرہ۔ باقی اسمائے کے لئے تذکیر و تانیث کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کے مرد و زن کا لاحقہ زیادہ کرتے ہیں جیسے کہ پیر مرد، پیر زن، اور جادوگر مرد، جادوگر زن وغیرہ۔ جانوروں کے لئے نر اور مادہ کا لاحقہ لگاتے ہیں جیسا کہ گربہ نر، گربہ مادہ اور شیر نر، شیر مادہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں جہاں اردو میں اسم کی تذکیر و تانیث کے فعل کی صورت بھی بدل جاتی ہے وہاں فارسی میں فعل کی صورت دونوں اصناف (مذکر و مؤنث) کے لئے ایک ہی رہتی ہے۔

اردو میں سنسکرت اور فارسی کے برعکس تذکیر و تانیث کے لئے مسلمہ قاعدے موجود ہیں جیسا کہ جس مذکر کے آخر میں "الف" کا لاحقہ ہو، اس کی تانیث کے آخر

میں "الف" لگا کر اس کی جگہ یائے معروف (ی) لگاتے ہیں جیسا کہ گھوڑا سے گھوڑی، لڑکا سے لڑکی وغیرہ۔ اگر مذکر کے آخر میں یائے معروف (ی) کا لاحقہ ہو تو اسے ہٹا کر اس کی جگہ "ن" زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے دھوبی سے دھوبن۔ قریشی سے قریشن وغیرہ۔

بے جان اشیاء کی تذکیر و تانیث کے لیے اردو میں کوئی قاعدہ کلیہ موجود نہیں جیسے کہ موسم کا لفظ خود مذکر ہے، لیکن مختلف موسموں کے نام مؤنث ہیں جیسے کہ سردی، گرمی، بہار اور برسات۔ اسی طرح صفت تفضیلی کا بھی اس سے کوئی تعلق نہیں، جیسے کہ رتی مونث ہے اور ماشہ اور تولہ مذکر، چھٹانک مونث ہے پاؤ اور سیر مذکر اور پھر پنسیری (پانچ سیر کا وزن) مونث ہے اور من مذکر ہے۔ اسے گذرے ہوئے دور میں سنسکرت سے گہرے تعلقات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

واحد اور جمع

سنسکرت میں اپنی بہن قدیم یونانی اور کئی ایک سامی الاصل زبانوں کی طرح واحد اور جمع کے ساتھ تثنیہ کا صیغہ بھی موجود ہے۔ تثنیہ کے صیغہ کا اردو میں استعمال نہ ہونا بھی اسے سنسکرت سے خاص طور پر ممیز کرتا ہے۔ دنیا کی اکثر قدیم زبانوں میں جمع کے ساتھ تثنیے کا صیغہ بھی موجود ہے۔

یہ امر ہمیں تاریخ کی ان گہرائیوں تک لے جاتا ہے جہاں کہ زبان ابھی اپنے عہدِ طفلی میں پرورش پا رہی تھی۔ اور اس کی ہیئت انسان کے محض ذاتی اور نزدیکی مشاہدات کی مرہونِ منت تھی۔ اس وقت انسان کے لیے "ایک" کے ساتھ "دو" کا عدد بھی ایک مسلمہ اکائی کی حیثیت رکھتا تھا، کیونکہ جب وہ روزمرہ کے مشاہدہ میں اپنے عزیز و اقارب کے جسم پر نظر ڈالتا تھا تو اسے آنکھ، کان، ناک، ہونٹ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب دو دو ہی نظر آتے تھے اور یہی حالت اس کے ماحول کی بھی تھی جہاں کہ حیوانوں، چرندوں، پرندوں وغیرہ کے سینگ، بازو، آنکھ، کان

وغیرہ کی بھی یہی تثنیہ، صورت تھی۔ لامحالہ اس کے لئے دو کا عدد جمع کے عدد سے ایک بالکل الگ اور مختلف شے تھی، جس کے اظہار کے لئے اسے ایک نئی اصطلاح کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی قدیم سامی اور آریا الاصل زبانوں میں واحد اور جمع کے ساتھ تثنیہ کا صیغہ بھی موجود ہے، اگرچہ اب اس کا استعمال دن بدن متروک ہوتا جا رہا ہے اور دُنیا کی اکثر زبانیں اسے بالکل متروک کر چکی ہیں۔

سنسکرت میں تذکیر و تانیث کی طرح واحد اور جمع کے صیغے میں بھی کئی عجیب و غریب خصوصیتیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر تین سے لے کر انیس تک کے اعداد کے لئے ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اور تذکیر و تانیث کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا جیسے

پندرہ آدمیوں (مذکر) کے لئے پنچدشا ہیرشا کہیں گے اور

پندرہ فوجوں (مؤنث) کے لئے پنچدشا سینانی

لیکن بیس سے لے کر نوے تک کے اعداد کیلئے ہمیشہ صیغہ واحد مونث استعمال ہوتا ہے جیسے

"میرے لئے اکیس آم لاؤ" کا ترجمہ بجائے اک ونشتی امرا (مذکر) معانیہ" کے "اک ونشتو امرانی (مؤنث) معانیہ" کریں گے۔

اسی طرح صیغہ واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم کے صیغہ کے استعمال کو ترجیح دی جاتی ہے، یعنی اپنے لئے بجائے "اہمو" (میں) کے "دیامو" (ہم) استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اردو میں بڑا آدمی ہی اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس نچلے طبقے کے لئے حقارت کے طور پر زیادہ تعداد (جمع) کے لئے بھی واحد کا صیغہ ہی استعمال ہوتا ہے۔

جمع بنانے کے لئے اکثر اسم پر "واؤ" کا لاحقہ لگا کرتے ہیں، مثلاً "کرتن" (بیوقوف) سے "کرتنو"۔ "الپس" (پانی) سے "الپسو" اور

"یدھ" (جنگ) سے "یدھو"۔ اگر اسم کے آخر میں الف ہو تو اُسے حذف کر کے واؤ لگاتے ہیں۔ مثلاً "وشا" (سمت) سے "وشو"۔

فارسی میں بھی اس وقت اُردو کی طرح صرف واحد اور جمع کے دو صیغے ہیں، اگرچہ اوستائی میں باقی آریائی حلقہ کی زبانوں کی طرح تثنیہ کا صیغہ موجود تھا لیکن اب جدید یونانی کی طرح اس کا استعمال متروک ہے۔

واحد سے جمع بنانے کے لئے جاندار اسمائے کے آخر میں "ان" زیادہ کرتے ہیں جیسے مرد سے مرداں، زن سے زناں، سگ سے سگاں وغیرہ۔ اگر واحد کے آخر میں ہائے مختفی موجود ہو تو اسے حذف کر کے "گاں" لگا دیتے ہیں، جیسے بندہ سے بندگاں، بچہ سے بچگاں، کشتہ سے کشتگاں وغیرہ۔ اگر واحد کے آخر میں الف یا واؤ ہو تو "یاں" زیادہ کرتے ہیں، جیسے دانا سے دانایاں، خوبرو سے خوبرویاں وغیرہ۔

بے جان اسموں کی جمع بناتے وقت واحد کے آخر میں "ہا" لگاتے ہیں، جیسے قلم سے قلمہا، صندلی سے صندلی ہا وغیرہ۔ اگر واحد کے آخر میں ہائے مختفی ہو تو "ہا" لگانے سے پہلے اسے حذف کر دیتے ہیں، جیسے نامہ سے نامہا، خامہ سے خامہا وغیرہ۔ لیکن اگر آخر میں ہائے ملفوظی (ہ) ہو تو اسے حذف نہیں کرتے، جیسے زرہ سے زرہ ہا، کلاہ سے کلاہ ہا وغیرہ۔ بعض اوقات واحد کے آخر میں ہائے مختفی ہونے کی صورت میں اس پر "جات" زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے قلعہ سے قلعہ جات، نقشہ سے نقشہ جات وغیرہ۔ بعض الفاظ کی جمع عربی قاعدے سے بھی بناتے ہیں جیسے بیگم سے بیگمات، مکان سے مکانات وغیرہ۔

فی زمانہ جدید فارسی میں جمع بنانے کے لئے جاندار یا بے جان کی تمیز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے "ہا" کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان ہے۔ جیسے درخت سے درختہا، ایرانی سے ایرانی ہا، کوچہ سے کوچہ ہا، بچہ سے بچہ ہا وغیرہ

اُردو میں فارسی کے برعکس مذکر اسم کے آخر میں اگر "الف" یا "ہ"

ہو تو جمع بنانے کے لئے یائے مجہول (ے) سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے گھوڑا سے گھوڑے، لڑکا سے لڑکے، تولہ سے تولے وغیرہ اگر اسم کے آخر میں "اں" ہو تو جمع بناتے وقت "الف" کو یائے مجہول اور ہمزہ سے بدل دیتے ہیں، جیسے دھواں سے دھوئیں، کنواں سے کنوئیں وغیرہ۔ اگر مذکر کے آخر میں "الف" یا "ہ" ہو تو واحد اور جمع دونوں میں وہی شکل رہتی ہے۔ جیسے دس میل، پندرہ سیر، چالیس گز وغیرہ۔

مؤنث اسموں کی جمع کے لئے اگر اسم کے آخر میں "یا" ہو تو نون غنہ (ں) زیادہ کرتے ہیں، جیسے گڑیا سے گڑیاں، چڑیا سے چڑیاں وغیرہ۔ اگر آخر میں یائے معروف (ی) ہو تو "اں" زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے مرغی سے مرغیاں، قینچی سے قینچیاں، کلی سے کلیاں وغیرہ۔ اگر آخر میں حرف "الف" یا "واو" ہو تو "ئیں" زیادہ کرتے ہیں، جیسے ہوا سے ہوائیں، دوا سے دوائیں، خوشبو سے خوشبوئیں وغیرہ۔ اگر آخر میں مذکورہ بالا حروف میں سے کوئی نہ ہو تو "یں" زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے کتاب سے کتابیں، قلم سے قلمیں، بہن سے بہنیں وغیرہ۔

غیر ملکی الفاظ کی جمع ان کی اُردو مشابہت پہ بناتے ہیں، جیسے الماری سے الماریاں، گرجا سے گرجے، میز سے میزیں، نب سے نبیں وغیرہ۔

گرامری تفاوت

واضح رہے کہ اُردو زبان کا صرف نحو کے لحاظ سے فارسی اور سنسکرت سے نہ صرف فروعی بلکہ اصولی اور بنیادی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بات کسی طرح ذہن میں نہیں آتی کہ ایک زبان کی شاخ اپنی اصل سے اتنی مختلف ہو۔ دُنیا کی زبانوں کی تاریخ میں ہمیں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ اگر لغوی اشتراک کو ہی زبانوں کے باہمی رشتے کا معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور ہسپانوی زبانوں میں عربی الاصل الفاظ کا اتنا حصہ موجود ہے کہ فارسی اور ہسپانوی کو بجائے

آریائی الاصل ہونے کے سامی زبانوں کی شاخیں قرار دیا جاسکتا ہے، خاص کر جب کہ فارسی زبان کا نہ تو سرمایۂ الفاظ ہی بلکہ ایک حد تک اس کی صرف و نحو بھی عربی سے متاثر ہے اور اس کا رسم الخط بھی سامی ہے۔ اگر فارسی اور ہسپانوی کو، لغوی اور دیگر پہلوؤں میں مشابہت کی بنا پر، سامی زبان کی شاخیں نہیں مانا جاتا تو پھر اردو کو محض لغوی مطابقت کی بنا پر کس طرح سنسکرت یا آریائی زمرہ کی شاخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر فارسی اور ہسپانوی میں عربی اور اردو میں فارسی الفاظ کا عنصر مسلمان حملہ آوروں کا مرہونِ منت ہے تو پھر اردو زبان میں سنسکرت الاصل الفاظ کی موجودگی کو آریائی قبائل کے اردو کا نتیجہ قرار دینے میں کونسا امر مانع ہے۔

ہڑپہ کی طرف

جب یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اردو زبان کا سرچشمہ نہ تو سنسکرت ہے اور نہ فارسی تو ایک صدیوں پرانا مفروضوں کا فلک بوس محل آنِ واحد میں زمین پر آ رہتا ہے اور ہمارے سامنے میدان پھر خالی کا خالی رہ جاتا ہے۔ اِس خلاء کو پُر کرنے کے لئے ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا کہ ہم اُردو کی اصل کی تلاش کہیں اور کریں۔

سنسکرت اور فارسی کے بعد کوئی ایسی غیر ملکی زبان میدان میں نہیں رہ جاتی کہ جسے اُردو کی اصل کے طور پر پیش کیا جاسکے، اس لئے لامحالہ ہمیں برصغیر پاک و ہند کی قدیم زبانوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جب ہم اُردو زبان کے معنوی سرمائے اور صرف و نحو کا موازنہ برصغیر پاک و ہند کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ صرف و نحو کے

لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی بُنیادیں وادیٔ سندھ ہی میں استوار ہوئی ہیں اور اس کا سلسلۂ نسب پنجابی، اپ بھرنش اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد کی زبانوں سے جا ملتا ہے جو آریاؤں کی آمد سے قبل وادیٔ سندھ میں مروج تھی۔

اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ہڑپائی تہذیب کے دور میں یہاں کون سی زبان مروّج تھی اور برصغیر کی قدیم زبانوں کے کونسے کنبے سے تعلق رکھتی تھی۔

ہڑپہ سے پہلے

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کوششوں کے طفیل ہڑپہ، موئن جوداڑو اور دیگر مقامات پر برصغیر کی آریاؤں سے قبل کی تہذیب کے آثار برآمد ہوئے تو محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اس تہذیب کی گم گشتہ کڑیوں کی تلاش میں موجودہ مغربی پاکستان بھارتی پنجاب، راجستھان، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ اس کے نتیجہ میں کئی ایک مقامات پر ہڑپائی تہذیب سے بھی قدیم تہذیب کے آثار سامنے آئے، جن میں موئن جوداڑو کے قریب واقع "آمری" اور بلوچستان میں "نال" کے مقامات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر اسے "آمری نال تہذیب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ "آمری نال تہذیب" ہڑپائی تہذیب سے قدیم تر ہے یعنی ہر جگہ اس تہذیب کے آثار ہڑپائی تہذیب کے آثار سے نچلی سطح پر پائے گئے ہیں۔

"آمری نال تہذیب" منڈا قبائل کی تہذیب ہے جو برصغیر کے قدیم ترین باشندے تھے۔ منڈا تہذیب پر کم از کم پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔

اس طویل عرصہ میں یہاں مختلف تہذیبوں اور زبانوں کی لہریں ہی نہیں بلکہ لامتناہی ریلے آتے رہے جن میں سے ہر ایک طوفان میں یہی نظر آتا تھا کہ وہ سابقہ روایات کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود یہاں آج بھی ایسے رسم و رواج اور لسانی عناصر موجود ہیں جو ان طوفانوں کی یورشوں سے محفوظ رہے، اور آج ہم ان سے گئے گزرے دور کے مدھم پڑتے ہوئے نقوش میں شواہد کا رنگ بھر کر انھیں اُجاگر کرنے میں مدد لے سکتے ہیں۔

فی زمانہ منڈا قبائل بھارت میں راجستھان سے لے کر بہار تک پھیلے ہوئے ہیں، خاص کر وسط ہند ان کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ قبائل اکثر تہذیب و تمدن کی دنیا سے دُور گھنے جنگلات میں آباد ہیں۔ ان میں کچھ قبیلے بھارت میں) رانچی اور چھوٹا ناگپور کے گھنے جنگلات میں بستے ہیں۔ یہ صرف تہذیب و تمدن بلکہ مغربی پاکستان[1] کی حدود سے تو کالے کوسوں دُور واقع ہیں۔ اس صورت میں کسی طرح یہ دعویٰ کہ ناممکن نہیں کہ ان دُور افتادہ خطوں میں رسم و رواج اور لسانی مطابقت منڈا اور غیر منڈا اقوام کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ قبائل ہیں جو بیرونی دُنیا سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے، اس لئے سنسکرت اور بعد میں آنے والی دوسری ہمسایہ زبانیں اس کے خالص پن کو متاثر نہیں کرسکیں۔

سب سے پہلے ہم رسم و رواج اور تہواروں کو لیتے ہیں۔ جب ہم شادی غمی کی مختلف رسموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں کئی ایک ایسے رسم و رواج ہیں جن کا مقصد اکثر ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے، لیکن ہم ان پر صرف اس لئے عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے، اور انھوں

---

[1] منڈا قبائل کے کچھ رسم و رواج اور تہواروں کو پنجابی زبان میں بتایا ہے اور پنجاب مغربی پاکستان میں ہے۔

نے یہ رسمیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں پائی تھیں۔ اس طرح معلوم نہیں ان کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک جا پہنچتا ہے۔ یہاں ہم کچھ ایسی ہی رسموں کا ذکر کرتے ہیں جن کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ کم از کم پانچ ہزار سال سے تو ضرور رائج ہیں، اور اس سے زیادہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ رسمیں وادیٔ سندھ میں اس وقت رائج تھیں جب کہ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی دراوڑی تہذیب نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔

منڈا قبائل میں پائی جانے والی ذیل کی رسمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

دل دا: اس کے معنی ہیں گرانا (دا بمعنی پانی، دل بمعنی گرانا۔ پنجابی ڈولھنا) جب دلہا دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لاتا ہے تو دلہا کی ماں ان دونوں کو پانی کے چھینٹے مارتی ہے اور ان کے سر پر وار کر پانی پیتی ہے۔ پنجابی میں اس رسم کو "پانی وارنا" بمعنی پانی نچھاور کرنا کہتے ہیں۔

دا ہرچی: اس رسم سے یہ مراد ہے کہ جب دلہا دلہن کے گھر شادی کی غرض سے پہنچتا ہے تو اس کی ساس اس پر پانی نچھاور کر کے اس کا استقبال کرتی ہے۔ یہ رسم بھی پنجاب میں موجود ہے۔

دا آؤ: اس کے معنی ہیں پانی لانا۔ شادی کے موقع پر دلہن کے گاؤں کی چار کنواری لڑکیاں پڑوس کے تالاب، ندی یا نالے سے پانی بھر کر دلہن کے گھر لاتی ہیں۔ پنجاب کے دیہات میں یہ رسم "گھڑولی" کے نام سے رائج ہے۔

چاؤ ہیپر: دلہن کے سسرال آنے پر اس کی ساس اس کے سر پر چاول نچھاور کرتی ہے۔ یہ رسم بھارتی پنجاب کے ہندوؤں میں ابھی تک موجود ہے

منڈا اوا دارم ٹکا: جب بارات شادی کے پنڈال کی طرف رُخ کرتی ہے تو دلہن کی رشتہ دار عورتیں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور جب تک بارات والے انھیں کچھ معاوضہ ادا نہیں کرتے یہ راستہ نہیں چھوڑتیں۔ پنجاب میں اس قسم کے معاوضہ مانگنے کو "لاگ" کہتے ہیں۔

لیجا: اس کے معنی ہیں کپڑا۔ شادی کے موقع پہ مختلف رشتہ داروں کو جو کپڑے کی چادریں دی جاتی ہیں انھیں "لیجا" کہتے ہیں، مثلاً اینگا باگے لیجا (ساس کا کپڑا) سالا لیجا (سالے کا کپڑا)۔ پنجاب میں اس قسم کے کپڑوں کو "بر یجا" کہتے ہیں۔

بالا: اس کے معنی ہیں بارات۔ اس کا نشان ہمیں "سربالا" کے لفظ میں ملتا ہے۔ جس کے معنی ہیں بارات کے آگے لگنے والا۔ ویسے منڈا قبائل میں بھی یہ رسم موجود ہے۔ وہاں "سربالا" کو "لوکنڈی" کہتے ہیں۔

پوہل: منڈا قبائل میں جب دو آدمی ایک دوسرے کے ساتھ گہری دوستی یا بھائی چارہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ رسم ادا کرتے ہیں۔ سکھ مذہب میں یہ رسم انھیں معنوں میں بطور ایک مذہبی فریضہ کے موجود ہے، جسے وہ "پوہل چھکنا" کہتے ہیں۔

منڈا تہواروں میں کرم، ماگھی اور پھاگو خاص طور پہ قابل ذکر ہیں:

کرم: یہ تہوار بھادوں کے مہینے میں چاند کی گیارھویں تاریخ کو منایا جاتا ہے پنجاب میں اس تہوار کو "تیاں" کہتے ہیں۔ جب کہ دیہات کی بہو بیٹیاں گاؤں سے باہر جاکر درختوں پہ جھولے ڈالا کرتی ہیں۔ یہ رسم بھارت میں موجود ہے۔ مگر پاکستان میں ہندوؤں کے جانے کے ساتھ ہی یہاں سے ختم ہو گئی۔

ماگے پرب: یہ تہوار پوس کے مہینے میں پورے چاند کے دن منایا جاتا ہے۔ اس دن ان کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔ اس تہوار پہ وہ بزرگوں کی روحوں کی پوجا کرتے ہیں۔ پنجاب کے ہندوؤں میں یہ تہوار "ماگھی" کے نام سے مشہور تھا اور اس دن وہ اپنے متبرک دریاؤں پہ جاکر نہاتے اور پوجا پاٹ کرتے تھے۔

پھاگو: یہ تہوار ماہ پھاگن کے پورے چاند کے دن منایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں یہ تہوار "ہولی" کے نام سے مشہور ہے۔ جب کہ وہ ایک دوسرے

پر رنگ پھینکتے ہیں اور رنگ رلیاں مناتے ہیں۔

اب ہم منڈاری اور وادیٔ سندھ کی موجودہ زبانوں کے تقابلی جائزے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ گو ان دونوں گروہوں کے تمام تر مشترکہ سرمایۂ الفاظ کا احاطہ کرنا ممکن نہ ہوگا کیونکہ اس کے لیئے ایک کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اس لیئے ہم اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیئے اس کا ایک مختصر سا انتخاب پیش کرنے پر اکتفا کریں گے:

رشتہ جات

نانا۔ نانی، ماما مامی، پھپھا پھُپھو (پنجابی پھپھی بمعنی بوا)

سالا سالی، موسی (پنجابی ماسی بمعنی خالہ)، ساندھو وغیرہ۔

بر: بمعنی دلہا (پنجابی ور)۔ غالباً بارات کا لفظ بھی اسی "بر" سے مشتق ہے۔ نیز پنجابی "وری" بمعنی دلہا کی طرف سے دلہن کو دیا گیا لباس۔

گرھی: گرہی بمعنی دلہن، بیوی۔ چولستان کے علاقہ میں بہو یا بیوی کو گرہی کہتے ہیں جبکہ باقی پنجاب میں یہ لفظ بیٹی یا عام لڑکی کے لیئے استعمال ہوتا ہے۔

پیرھی: پیڑھی بمعنی نسل۔ پنجابی زبان میں انھیں معنوں میں مستعمل ہے۔

منڈاری زبان میں باپ کے لیئے ابا اور آپو کے الفاظ مستعمل ہیں جو کہ اردو باپ، ابا اور ابو، پنجابی باپو اور آپو سے مشابہ ہیں۔

جسمانی اعضا

منڈاری	معنی	پنجابی	اردو
دیھہ	جسم	دیھہ	—

منڈاری	معنی	پنجابی	اردو
منڈی	سر	منڈی	—
ڈوبیا	کمر، پیٹھ	ڈھوئی	—
کنڈ	کمر، پیٹھ	کنڈ	—
کھری	پاؤں	کھر	—
جانگ	ران	جنگھ نیز جانگیہ بمعنی لنگوٹ	—
بکا	دل	بکڑا	—
چالم	دم	—	چھلا (دم چھلا)
موآنرا	چہرہ، خط وخال	مہاندرا	

زیورات، لباس وغیرہ

منڈاری	معنی	پنجابی	اردو
مُندرا	کانوں کا زیور	مُندرے، مُندراں	—
نتھ	ناک کا زیور	نتھ	نتھ
تکوبیُ	کانوں کا زیور	ٹوکاں	—
کاجہ	کاجل	کجل	کاجل
گہنا	زیور	گہنا	گہنا
آنچل	پلا، دامن	—	آنچل
انگا	لباس، کوٹ	انگی بمعنی بنیان	انگرکھا
گانجی	صدری	گنجی بمعنی بنیان	—
لاہنگا	لنگوٹ	لنگ بمعنی لنگوٹ، لہنگا بمعنی گھگرا، لنگی بمعنی کمر میں باندھنے کی چادر	لہنگا، لنگوٹ

اردو	پنجابی	معنی	منڈاری
-	ڈھسا	اونی چادر	ڈھسا
-	لیڑا (نیز ریجا بمعنی بیاہ شادی پر دیا جانے والا کپڑا)	کپڑا	لیجا
لتا	لیڑا (نیز لیراں)	پھٹا پرانا کپڑا	لیدرا لیجا
-	چیرطا (نیز چیرا بمعنی پگڑی)	کپڑا، دوپٹہ	چیرا
-	کھڑی، کھڑاواں، کھڑاؤں	جوتے	کھاوڈے
-	بگلی	ستیلی، بٹوا	باگلی
-	توڑا	توڑا، روپیہ پیسہ رکھنے کی تھیلی	توڑہ

زمانۂ قدیم میں غلے کو تولنے کے لئے علاوہ ازیں ماپ کر بھی تقسیم کیا یا بیچا جاتا تھا۔ یہ ماپ ایک مخصوص مقدار کے لئے لکڑی یا دھات سے بنائے جاتے تھے۔ پنجاب کے دیہات میں آج بھی یہ پیمانے "ٹوپا" اور "وٹی" کے نام سے مستعمل ہیں۔ ذیل میں قریباً برابر مقدار کے منڈاری، دراوڑی، پنجابی اور کشمیری پیمانے درج کئے جاتے ہیں:

کشمیری	پنجابی	دراوڑی	منڈاری
لپ	لپ	سیرا	لپ (ہتھیلی بھر)
چھوا، سیر	وٹی (پونے دو سیر)	پاٹی (سوا سیر، ڈھیڑ سیر)	پاٹی (غلے کا پیمانہ)
اڑی (پانچ سیر)	دھڑی (پانچ سیر)		

ان پیمانوں میں پاٹی یا وٹی کا پیمانہ قدامت کے لحاظ سے سب سے پرانا معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہڑپائی دور کی دکانوں پر یہ پیمانہ عام مستعمل ہو گا۔

منڈاری کاٹ قریباً چالیس سیر کے برابر غلے کا پیمانہ، پنجابی میں کٹا، ایک من کی بوری کو کہتے ہیں۔

گنتی کی اکائی

گنتی کے لحاظ سے منڈاری اور سندھی دونوں میں دو کے ہندسے کے لئے "با" کا لفظ مشترکہ طور پر مستعمل ہے۔ پنجابی اور اردو میں "بارہ"، "بیس" وغیرہ ہندسوں میں "ب" کا حرف اسی "با" یعنی دو کی ترجمانی کرتا ہے جیسے بانوے۔ با+نوے یعنی دو اور نوے۔

اسی طرح منڈاری زبانوں میں کوڑی یعنی بیس گنتی کی اکائی کے طور پر مروج ہے منڈاری لفظ "کم" بمعنی ہاتھ اس کی اصل ہے۔ کوڑی لفظ "کم" کی جمع ہے، جس کے معنی دونوں ہاتھوں اور پاؤں کا مجموعہ یعنی بیس انگلیاں ہیں۔ غالباً قدیم ہی سے منڈا قبائل ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کی تعداد کو گنتی کی اکائی کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے۔ آج بھی پنجاب کے دیہات میں یہی اکائی عام مروج ہے جیسے سوکھ دیہات میں "پنج ویہیاں" (یا پنج بیسے) اور ایک سو تیس کو "چھ ویہیاں تے دس"، یعنی چھ بیسے اور دس کہتے ہیں۔

خوردونوش

منڈاری اور پنجابی میں اناج، ان پائی، دانہ پانی دال اور گڑ ایک معنوں میں مستعمل ہیں۔

نباتات

منڈاری، پنجابی اور اردو میں ببول، بکائن، بڑ (پنجابی بوہڑ) ریٹھا، دھتورہ، ککڑی، کریلا، نیم، پپیتا وغیرہ نام مشترک ہیں۔ منڈاری بڑ

بمعنی گھنا جنگل اور ناڑ بمعنی چاول یا گندم کی بالی کا نچلا حصہ پنجابی میں بھی انھیں معنوں میں مستعمل ہے۔ منڈاری ڈھنڈی، پنجابی ٹمنڈا، اردو ٹینٹ بمعنی کپاس کا ڈوڈا ایک ہی معنوں میں مستعمل ہیں۔

حیوانات

منڈاری	معنی	پنجابی	اُردو
اَرنا	پوری عمر کا بھینسا	—	اَرنا بمعنی جنگلی بھینسا
بچھا، بچھی	بچھڑا، بچھڑی	وچھا، وچھی	بچھڑا
ہاڑا	بیل	ویہڑا	—
مینڈھی	بھیڑ	مینڈھا (نر بھیڑ)	مینڈھا
لڈ، لیڈ	جانور کا فضلہ	لِد بمعنی گھوڑوں اور گدھوں کا فضلہ، لیڈا: اونٹ کا فضلہ	لید

ضروریاتِ زندگی

مُنڈاری	معنی	پنجابی	اُردو
آوا	کمہاروں کی برتن پکانے کی بھٹی	آوا (برتن پکانے کی بھٹی)	آوہ
باٹھا	بھٹہ	پہٹھا	بھٹہ
بھٹی	شراب نکالنے کی بھٹی	پہٹھی	بھٹی
چولاہا	چولھا	چلہا	چولھا
ہانڈا	سالن وغیرہ پکانے کا برتن	ہانڈی (سالن پکانے کا برتن)	—

منڈاری	معنی	پنجابی	اردو
تسلا	تڑکنی تھالی نما برتن	تسلا	—
بنڈا	برتنوں کے نیچے رکھنے کا حلقہ	بنڈا	—
چاٹو	مٹی کا برتن، گھڑا	چٹورا (دودھ وغیرہ گرم کرنے کا برتن) چاٹی۔ گھڑا	—
چپنی	تھالی	چپنی (گھڑے کا تھال نما ڈھکنا)	—
ڈاپنی	تھالی نما ڈھکنا	—	ڈھاپنی
پینڈا	برتنوں کا نچلا حصّہ	پینڈا	—
چمٹا	دست پناہ	چمٹا	چمٹا
چانگیرا	تھالی نما ٹوکری	چنگیر (بانس کے پتوں یا بانڑ کی بنی ہوئی روٹی رکھنے کی ٹوکری)	
دورا، دوری	بڑا اور چھوٹا ٹوکرا	دورا، دوری (مٹی کے ٹوکری نما برتن)	—
ڈالا	ٹوکرا	ڈل (سبزی یا پھل وغیرہ رکھنے کا بڑا ٹوکرا)	—
گاگرا	پانی کا برتن	گگر	گاگر
ڈالی	ڈھکنے کے بغیر ٹوکرا	ڈالی (چھوٹی ٹوکری جس میں عام طور پر پھلوں یا پھولوں کا تحفہ دیا جاتا ہے)	—
کھانچی	بڑے منہ کا بانس کا ٹوکرا	کھونچا (بڑا ٹوکرا)	خوانچہ
پیٹی	بانس کا ڈھکنے والا ٹوکرا	پیٹی، صندوق	—
ٹنڈ	راہٹ میں استعمال ہونے والے مٹی کے کرنے	ٹنڈ	—

مُنڈاری	معنی	پنجابی	اُردو
مونگرا	لکڑی کا ہتھوڑا	مونگلی	موگری
ہناؤ	آہرن	ہنائی	ہنائی
آرا	لکڑی چیرنے کا اوزار	آرا	آرہ
باہنگا	وہ بانس جس کے دونوں سروں پر سامان ٹنگا کر کندھوں پر لے جایا جاتا ہے۔	وہنگی	بہنگی
ڈنڈا	چھڑی	ڈنڈا	ڈنڈا
آبم	نیزہ	بلم	بلم
ڈھال	سپر	ڈھال	ڈھال
بہی	کتاب	وہی (حساب رکھنے کی کتاب)	بہی
بھنڈار	خزانہ، مال گودام	بھنڈار	بھنڈار
کالو، کھولو	کولھو	کولھو	کولھو
کاڑے	کھلی	کھلی	کھلی
چپری	چھوٹا چھپر	چھپری	چھپر
جھوپڑی	جھونپڑی	چھونپڑی	جھونپڑی
ماچا	چبوترا نما چھتاؤ	—	مچان
منڈوا	عارضی طور پر بنایا گیا پنڈال	منڈوا	منڈوا
دالان	اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت، دیواروں سے گھرا ہوا آنگن	دالان	دالان

متفرقات

اُردو	پنجابی	معنی	مُنڈاری
سامی	سامی	کرایہ دار، مقروض	اسامی
آڑ	آرٹ	ہوا سے بچاؤ کے لئے کپڑے یا پتوں کا پردہ	آرٹا
باڑھ	—	سیلاب	باڑی، باڈڑ
بخرہ	وکھرا	حصّہ	بکھرا
بھاڑا	پہاڑہ	کرایہ	بھاڑہ
بھوسہ	پھوس	بھوسہ	بوسہ
باسی	بہیا	پچھلے دن کا بچا ہوا کھانا	باؤ، باسی
چیلا	چیلا	پیرو کار	چیلا
دھندہ	دھندہ	کارو بار	دھندہ
ڈھیلا، ڈلی	ڈلا	مٹی کا ڈلا	ڈھیلا
ڈھارس	دھرواس	صبر	ڈھارس
ڈھیٹ	ہنہٹھ	بے شرم۔ ڈھیٹ	ڈھیٹ
دھول	دھوڑ	غبار	دھوڑ
گدرا	گدرا	نیم پختہ پھل	گادرا
گنج	گنج، گنجبر	ڈھیر	گنجاؤ
گرد	گردا	غبار	گردا
گیرو	گیرو	سُرخ رنگ	گیرو
ہریالی	ہرے وائی	سرسبزی	ہاریار

مُنڈاری	معنی	پنجابی	اُردو
جھورا	آبشار	جھرنا	جھرنا
جھاڑیا	بارش کا برسنا	جھڑی	جھڑی
کسرہ	خارش کے دانے	کھسرہ	خسرہ
گُٹنا	دلال، بھڑوا، لگانے بجھانے والا	گُٹی (مؤنث)	گُٹنا
لاگ	دُشمنی	لاگت بازی	لاگ ڈانٹ
لار	قطار، رال، منکوں کی لڑی	لاڑ، قطار، لال، رال	رال
لو	جلانا، بھون ڈالنا	لُوہنا، جلانا، لو: گرم ہوا	لُو
مورکھ	جاہل، بیوقوف	مورکھ	مورکھ
منڈلی	اکٹھ، گروہ	منڈلی	منڈلی
بتو	بنیاد	نیوں، نینہ	نیو
نج	ذاتی	نجی	نج، نجی
سگڑ	نیک	سگھڑ	سگھڑ
اگمہ	اگم	-	اگم
جا، جاء	کوئی یا کچھ	-	جو
آرظ، اوڑ	اور دوسرا	ہور	اور
آکا باکا	حیران وششدر	آکا باکا	ہکا بکا
اچاکا	فوراً ہی خلاف امید	اچن چیت، اچاں چک	اچانک
اندھ کپ	نہایت ہی اندھیرا	انہیرا گھپ	گھپ اندھیرا
اڑوس پڑوس	ہمسائیگی	اڑوس پڑوس	پڑوس
پھوسو، بھوسو	نرم، پھسپھسا نہایت ہی سست	پھسپھسا، نرم پھوس = گوبر	پھسپھسا

مُنڈاری	معنی	پنجابی	اُردو
چھک مکاؤ	چمکنا	جگ مگ	جگ مگ
چتر بتر	بکھر جانا	تتر بتر	تتر بتر
ڈیڈباؤ	آنکھیں بھر آنا	ٹپ ٹپ آنسو گرنا	ڈبڈبا آنا
دکادکی	ایک دوسرے کو دھکیلنا	دھکادکی	دھکم پیل
دندناؤ	غرور سے چلنا	—	دندنانا
دااڑ دھوپ	ادھر اُدھر دوڑنا، سخت محنت کرنا	—	دوڑ دھوپ
دھوم دھام	شان و شوکت	دھماں پا دینیاں	دھوم دھام

افعال

اینٹھاؤ	ہلکا سا مروڑنا، نچوڑنا	—	اینٹھنا
اٹکاؤ	روکنا، منع کرنا	ہٹکنا، روکنا	اٹکانا
باہلاؤ	دل خوش کرنا	پہلانا	بہلانا
چک	غلطی کرنا، بھول جانا	چک جانا	چوک جانا
چاکا	ذائقہ چکھنا	چکھنا	چکھنا
دبکاؤ	گھات میں بیٹھنا	—	دبکنا
دھاک	گرمی، شعلہ	دھکنا	دھکنا
ڈونگا	لٹکنا، لٹکانا	ٹنگنا	ٹانگنا
ہپ	کاٹ کھانا، نگلنا	ہڑپ کرنا	نگل جانا
جھلکاؤ	چمکنا	جھلک، نظارہ	جھلکنا
جھپٹاؤ	پکڑنا، آدبوچنا	جھپٹنا، جھپٹ مارنا یعنی ایک دم چھین لینا	—

منڈاری	معنی	پنجابی	اُردو
ہاکاؤ	بلانا	ہاک مارنا، زور سے آوازہ دینا	ہانکنا
لپکاؤ	کود کر کسی چیز کو پکڑنا	لپکنا	لپکنا
مانجاؤ	برتنوں کو رگڑ کر صاف کرنا	مانجنا	مانجنا
اپناؤ	اختیار کرنا	—	اپنانا

اُردو کی اصل سنسکرت نہیں

اُردو زبان کی اصل سنسکرت یا کوئی آریائی زبان نہیں، بلکہ ان زبانوں میں سے کوئی ایک زبان ہے جو آریوں کی آمد سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں بولی جاتی تھیں۔

اس سلسلہ میں سر ولیم ولسن ہنٹر اپنی کتاب سلطنت ہند (THE INDIAN EMPIRE) میں شمالی ہند کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہتا ہے:

"شمالی ہند کی زبانیں براہِ راست سنسکرت سے مشتق نہیں ہیں، بلکہ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت سے بھی قدیم غالباً ویدوں کے زمانہ سے پیشتر یہاں ایک ایسی زبان مروج تھی جس سے سنسکرت اور قدیم پراکرتیں یعنی مقامی بولیاں وجود میں آئیں۔"

ماہر لسانیات سر جارج گریرسن کہتا ہے:

"خالص ہندوستانی الفاظ اردو کی ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ کلاسکی سنسکرت سے مشابہ قدیم ہندوستانی زبان سے مشتق ہیں۔ اس قدیم زبان نے کئی منزلوں سے گزرتے ہوئے آخر موجودہ ہندوستانی زبان کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم زبان اپنی اصلی صورت

بدلنے کے بعد اور موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے ایک پراکرتی دور سے گذری ہے۔"

"کلاسکی سنسکرت صدہا سال تک ہندوستانی زبان کو نہایت شدت سے متاثر کرتی رہی ہے لیکن یہ اس کا صرف سرمایۂ الفاظ ہی ہے جو اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ صرف و نحو کے لحاظ سے اس میں سنسکرتی اثرات کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا اور موجودہ ہندوستانی (اردو) زبان میں سنسکرت گرامر کا ایک بھی ترکیبی عنصر موجود نہیں۔"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر شہید اللہ دونوں اس خیال کے حامی نظر نظر آتے ہیں کہ شمالی ہند کی زبانیں براہِ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ قدیم پراکرتوں سے نکلی ہیں اور پراکرتیں مقامی بولیوں پر سنسکرت کے اثرات سے نتیجہ میں وجود میں آئیں۔

اُردو کی اصل — ہڑپہ اور موئن جو ڈڑو

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ قدیم زبان یا زبانیں کون سی تھیں کہ جن پر سنسکرت اثر انداز ہوئی؟ جب کولبروک، ولیم ہنٹر، چارلس لائل، میکس مولر، جان بیمز، جارج گریرسن وغیرہم لسانی تحقیقات میں مصروف تھے۔ اس وقت شمالی ہند کی تاریخ آریاؤں کی آمد سے شروع ہوتی تھی۔ اور اس سے پہلے ایک ایسا خلا تھا جس پر تاریکی اور لاعلمی کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ اِس لئے ان محققین کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اس قدیم زبان کو سنسکرت سے مختلف لیکن آریائی الاصل زبان قرار دیں۔ لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ آج محکمہ آثارِ قدیمہ نے ایک قدیم تہذیب کو کافی حد تک اجاگر کر دیا ہے۔ اِس لئے اب ہمیں اِس قدیم

زبان کو پہچاننے کے لئے مزید الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جن قبائل سے نووارد آریاؤں کو دوچار ہونا پڑا وہ ہڑپہ اور موئن جودڑو کے باشندے تھے اور ان دونوں کی زبانوں کی باہمی آمیزش کے نتیجہ میں نئی بولیوں نے جنم لیا اور یہی بولیاں نئی زبانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

یہاں اس امر کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ نوواردوں (آریاؤں)، کی زبان نے یہاں کی مقامی زبانوں کو محض متاثر کیا، انھیں نیست و نابود کر کے کسی نئی بولی کی بنیاد نہیں رکھی۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ مقامی زبانوں کی مقبولیت کے زیر اثر خود (سنسکرت) ختم ہو گئی۔ مقصد یہ ہے کہ کسی دوسری زبان سے متاثر ہونا اور بات ہے، چاہے یہ اثرات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں، اور اس کا کسی دوسری زبان سے مشتق ہونا اور بات ہے۔